خطبات اقبال

عابد پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی

خُطباتِ اقبال

خطباتِ اقبال

مُرتّبہ

رضیہ فرحت بانو

حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

بارِ اوّل

قیمت ۳؍

دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۵ر اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

فہرست خطبات

		صفحہ
۱- عرض مرتب		۷
۲- پیش رس	از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۹
۳- خطبۂ صدارت	الہ آباد	۲۵
۴- "	لاہور	۶۱
۵- "	علی گڈھ	۸۵

عرضِ مُرتّب

ترجمان حقیقت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے کلام کی نشر و اشاعت بہت عرصہ سے ہو رہی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت کم ایسے مسلمان ہوں گے جو اُن کے حیات افروز پیغام سے کم و بیش روشناس نہ ہوں لیکن صاحبِ ذوق حلقہ میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کے لئے ایک خاص تڑپ اور جستجو موجود تھی جو انھوں نے مختلف جلسوں میں بحیثیت صدر دئے۔

علامہ موصوف کے ان خطبات کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لئے میں نے ان کے تمام صدارتی خطبات اس مجموعہ میں جمع کر دئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شائقین اقبال اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اقبال کا کلام نظم ہو یا نثر اپنی سحر آفرینی اور دل افروزی میں بمثال ہے۔ اور اس کے جو اثرات مسلمانوں کے درماندہ قوم کے افراد، بالخصوص نوجوان طبقہ کے دل و دماغ آہستہ آہستہ

قبول کرتے نظر آتے ہیں، اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ خود اقبال کی آرزوؤں کی تکمیل اور اس کی دعاؤں کی قبولیت کا زمانہ انشاء اللہ جلد آکر رہے گا۔ اور یہ اس لئے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس دورِ مغرب زدگی میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی جو عدیم المثال اور جلیل القدر خدمت انجام دی ہے اسے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو جو شمشیر و سنان کو یکسر بھول کر محض طاؤس و رباب کے خواب آور نغموں میں گم ہو چکے تھے اور جن کا سرمایہ شعر و ادب انھیں یہ تلقین کرنے لگا تھا کہ

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

زیادہ تر شعر ہی کی چاشنی کے ذریعے سے لیکن وہ شعر جو "جزویست از پیغمبری" کے شرف کا حامل ہے، از سرِ نو قرآن کریم کے سرچشمۂ نور و ہدایت کے قریب کر دیا ہے اور یہی چیز مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح و نجات کی ضامن ہے۔

اس مردِ مومن کو مدت العمر شکایت رہی کہ "مرا یاراں غزلخوانے شمردند" اور اس نے ہمیشہ مسلمانوں کو پکارا کہ آؤ میرے ساتھ مل کر یہ سراغ لگانے اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ وہ کونسا زندگی بخش طریقِ کار ہے جو تمھیں تمھاری متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کے لئے اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ اس نے دعوت دی کہ

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش   اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

ضرورت ہے کہ مسلمان اقبال کے دلِ دردمند کی صدا کو سمجھنے کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوں شاید یہ ناچیز مجموعہ اس سلسلہ میں کسی قدر مفید ہو سکے۔

رضیہ فرحت بانو

پیش رس

قریب دس برس اُدھر کا ذکر ہے میں نے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے متعلق اپنی ایک مضمون کے اخیر میں لکھا تھا کہ "مُردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم، کاش اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندہ افراد کی قدر وہی قوم کرتی ہے جو خود زندہ ہو۔ یہ میدانِ فیض کے بحرِ کرم کی تلاطم خیزیاں تھیں جن کے تصدق اقبال جیسا گوہرِ یگانہ ہمارے جیسی مُردہ قوم کو عطا کر دیا گیا۔ اگر وہ کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتے تو نہ معلوم وہ قوم ان کے پیام حیات بخش سے شرفِ انسانیت کی کن بلندیوں تک پہنچ جاتی اور ان میں خود اقبال کا کیا مقام ہوتا۔ لیکن اقبال ہم مردہ پرستوں میں آیا۔ میو روڈ لاہور کے ایک گوشۂ تنہائی میں زندگی کے دن بسر کئے۔ اور یہ کہ کر چلا گیا کہ

دگر دانائے راز آید کہ ناید

اُسے عمر بھر کسی ایسے محرم راز کی تمنا رہی جو اس کے پیغام کی حقیقت کو پہچانے اور

اس کے ذریعے قوم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑائے۔ لیکن وہ اس حسرت کو اپنے دل میں ہی لے کر چلا گیا۔ اور کتنی بڑی حقیقت تھی جسے ان سادہ الفاظ میں بیان کر گیا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

کہنے والا کہہ گیا اور بعد کے زمانے نے اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق کر دی۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد (اپریل ۱۹۳۸ء سے آج تک) ان کی زندگی اور تصنیفات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اقبال کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ بنیادی غلطی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، حالانکہ وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میں شاعر نہیں، نہ شاعری میرا مقصود ہے۔ مثنوی رموزِ اسرار کی تمہید میں (جو علامہ اقبال کے پیغام کا سب سے پہلا مجموعہ ہے) وہ علانیہ کہتے ہیں کہ

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست

اور عمر بھر انھیں اس بات کا گلہ رہا کہ

مرا یاراں غزلخوانے شمردند

لیکن کلام اقبال کے شیدائی ہیں کہ انھیں شاعر ہی کی حیثیت میں پیش کرنے پر مُصر ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اقبال بظاہر ایک شاعر ہے اور بہت بلند شاعر، لیکن اس کی شاعری محض اس کے پیغام کے اظہار کا ذریعہ ہے، نہ کہ مقصود بالذات پھر یہ کیا قیامت ہے کہ اگر ایک مفکر اپنے افکار و تصورات کو نثر میں پیش کرے تو اسے مفکر سمجھا جائے لیکن اگر وہ انکا اظہار نظم میں کر دے تو وہ مفکر نہ رہے، فقط شاعر رہ جائے۔ اور اس کے

بعد اس کی حیثیت یہ سمجھ لی جائے کہ ہر وہ شخص جو فنِ شاعری کی چند اصطلاحات سے واقفیت حاصل کرلے، اس پر تنقید کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ محسوسات کے خوگر انسان کی سطح بین نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے مستفید نہیں ہوتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں جو ان حقائق کو مشہود بنائے ہوئے ہوتی ہیں۔ شاعری درحقیقت وہ حسین و جمیل نقاب تھا جس کے اندر حقیقی اقبال چھپا بیٹھا تھا۔ دنیا ابھی تک ان پردوں کے نگارستان میں محوِ تماشا ہے اور بہت کم نگاہیں ایسی تھیں جو حقیقتِ پسِ پردہ کو بے نقاب دیکھ سکتی تھیں۔

کچھ دوسری قسم کے لوگ ہیں جو اقبال کو ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے نزدیک اقبال کے افکار و نظریات کے ماخذ حکمائے مغرب، مثلاً نیٹشے، برگسان وغیرہ کے خیالات و تصورات ہیں اور اگر وہ بعض صورتوں میں ماخذ نہیں تو کم از کم اقبال کے خیالات ان فلاسفرز سے متاثر ضرور ہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت ہمارے حیطۂ بحث سے خارج ہے کہ اقبال کا فلسفہ کس طرح ایک مستقل اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس پیچیدگی کا آسان ترین حل یہ ہے کہ ہم خود اقبال سے پوچھیں کہ اس کے افکار و تخیلات کا سرچشمہ کیا ہے! علامہ اقبالؒ اپنی پہلی مستقل تصنیف (اسرار و رموز) کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں خدائے حی و قیوم کے پیغام آخریں یعنی قرآن کریم کے اسرار و معارف بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد وہ التجا کرتے ہیں کہ

گردِ لم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اور پھر اپنے لئے ایک ایسی بد دعا جس کے تصور ہی سے ہر مسلمان کی روح کانپ اٹھے۔ یعنی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے اپنی محرومی۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا — آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

یہ ابتدائی زمانے کی بات ہے اس کے بعد آخری وقت تک وہ اپنے ایک ایک سانس میں اس حقیقت کا اعلان کرتے رہے کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے قرآن سے سمجھا ہے اور جو کچھ سمجھ رہا ہوں قرآن سے سمجھ رہا ہوں۔ لہذا یہ کہنا کہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات اور اپنا فلسفۂ حیات مغرب کے حکماء سے مستعار لیا تھا، اس پر اتنا بڑا ظلم ہے جس کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہماری تعلیم یکسر مغرب کے افکار و تخیلات کی گداگری ہے اس لئے ہم ہمیشہ اس جذبۂ مرعوبیت میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر سچا موتی کسی نہ کسی مغربی سمندر کی صدف کا پروردہ ہے۔ حالانکہ اگر ہمیں اپنے ہاں کا کچھ بھی علم ہوتا، اور اس علم سے ہماری نگاہوں میں صحیح بصیرت پیدا ہو جاتی، تو ہم دیکھتے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی حقیقت کی کوئی کرن ہے، وہ قرآن کریم ہی کے چشمۂ نور کی رہینِ کرم ہے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم اُس خدا کا پیغام ہے جو حقیقتِ کلی اور صداقتِ مطلق ہے اور اس پیغام میں ذہنِ انسانی کی کسی قسم کی آمیزش کو کوئی دخل نہیں۔ قرآن سرتاپا روشنی ہے اور روشنی کا خاصا ہے کہ وہ ہر شے کی اصل حقیقت اور اس کے صحیح صحیح مقام کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس لئے جس مفکر کے افکار کا ماخذ قرآن ہو، اسے کہیں اور سے "دریوزہ گری" کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ قطع و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ

جہاں را جز بہ چشم خود ندیدم

لہذا پیام اقبال کو نہیں سمجھا جا سکتا تاوقتیکہ قرآن کو نہ سمجھا جائے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن خود ابھی تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ آج کی روشن خیال دنیا کے سامنے جب کسی "مذہبی کتاب" کا ذکر کیا جائے تو وہ اپنے ذہن میں اسے زمانہ کہن کی جہالت آمیز روایات اور توہم پرستی کا مجموعہ سمجھ لیتی ہے (اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں دنیا کا زیادہ قصور بھی نہیں کیونکہ دنیا کے سامنے جن کتابوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پیش کیا جاتا ہے ان میں اس قدر انسانی تصرفات ہو چکے ہیں کہ وہ فی الواقعہ توہم پرستی کا ایسا مجموعہ بن گئی ہیں جو انسانی عقل و بصیرت کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ چونکہ ذہن انسانی، مذہبی یا آسمانی کتابوں کے متعلق پہلے سے یہ تصور لیے بیٹھا تھا، اس لیے جب قرآن کریم کو دنیا کے سامنے ایک "آسمانی کتاب" کی حیثیت سے پیش کیا گیا تو اس نے بغیر دیکھے بھالے اپنا کلیہ اس پر بھی چسپاں کر دیا کہ یہ بھی (نعوذ باللہ) کہنہ روایات و مزخرفات اور اوہام و اضافیات کا مجموعہ ہے۔ اس غلط فیصلہ سے انسانیت نے اتنا بڑا نقصان اٹھایا ہے کہ اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اگر دنیا قرآن پر غور کر لیتی تو وہ آج جس جہنم میں گرفتار ہے اس میں کبھی مبتلا نہ ہوتی۔ لیکن اس باب میں غیروں سے زیادہ خود اپنوں سے گلہ ہے۔ اس دورِ سعید کے بعد جس میں مسلمانوں کی زندگی قرآنی نظام کے ماتحت مرتب ہوئی اور محمد رسول اللہ والذین معہ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مقدس جماعت نے دنیا کو عملاً بتا دیا کہ شرف و مجدِ انسانیت کا آخری مقام کیا ہے۔ قرآن کریم کی نورانی شمع پر عجمی تصورات کے الیے رنگین فانوس چڑھائے گئے کہ اس کی حقیقی روشنی انھیں فانوسوں کے رنگ میں کھو کر رہ گئی اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ آج جسے ہم بظاہر

قرآنی روشنی کہتے ہیں وہ درحقیقت ان ہی ذہنی فانوسوں کی رنگین روشنی ہوتی ہی۔ لہٰذا قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہی کہ انسان اپنے ذہن سے ان تمام خارجی نقوش کو مٹادے اور اس طرح افکار و خیالات کی ایک بالکل صاف اور سادہ لوح لے کر قرآن کا مطالعہ کرے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا ہی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہی کہ قرآن ہی کیا؟ کائنات کی ہر شی ایک لگے بندھے قانون کے تابع چل رہی ہی۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرّہ سے لے کر بڑے سے بڑے کرۂ سماوی، بلکہ ان کروں کے عظیم الشان اور محیر العقول نظام ہائے فلکی تک، ہر شی فطرت کے قوانین کے ماتحت ان امور کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہی جن کے لئے وہ پیدا کی گئی ہی۔ جب کائنات کی ہر شی کی یہ کیفیت ہی تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان جو اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی اور اس نظم مرصع کا مقطع کا بند ہی، اس قاعدے سے مستثنےٰ ہوگا؟ یہ ہو نہیں سکتا۔ انسان کے لئے بھی ایک ضابطہ حیات کی ضرورت ہی جس کے تابع وہ اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس طرح اس کے شرفِ انسانیت کی تکمیل ہو۔ دنیا نے تنہا عقل کی رو سے مختلف ضوابطِ حیات متعین کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور ان کوششوں کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے رہی۔ آج بھی جو کچھ مشرق و مغرب میں ہو رہا ہی انہی تلخ تجارب کا اعادہ ہی۔ جس طرح کائنات کی کسی دوسری چیز کے لئے انسان نے قوانین مرتب نہیں کئے، اس طرح انسان اپنی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے بھی خود قوانین مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ قوانین بھی وہیں مرتب ہوں گے جہاں سے دیگر اشیائے فطرت کے لئے قوانین وضع ہوتے ہیں۔ اس کا نام وحی ہی۔ یہ ہدایت جو نوع انسانی کے لئے بطور ضابطۂ زندگی عطا کی گئی ہی، قرآن کریم کے اندر ہی۔ یہ نہ کہنہ روایات کا مجموعہ ہی، نہ اوہام پرستی کی تعلیم۔ بلکہ ان سیدھے سادھے قوانین کی کتاب ہی جس کے

مطابق نوعِ انسان کو اس کرۂ ارض پر زندگی بسر کرنا ہی اور چونکہ یہ قوانین ہیں اس انسان کے لئے جو جو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہی اور جن کو الگ الگ نہیں بلکہ مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کرنی ہی اس لئے اس میں دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، پوپ اور قیصر کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہی جو انسانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہی اس میں انسان کی عائلی۔ معاشرتی۔ معاشی۔ سیاسی۔ غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق مکمل اصولی قوانین موجود ہیں جن کے متعلق گوئٹے کہتا ہی کہ

"یہ تعلیم کہیں بھی ناکام نہیں رہتی ہم اپنے تمام نظام ہائے زندگی کے باوجود اس تعلیم کی حدود سے آگے نہیں جا سکتے اور حقیقت یہ ہی کہ کوئی انسان آج تک اس سے آگے جا ہی نہیں سکا۔"

یہ قوانین کیا ہیں اور ان سے کس قسم کا اجتماعی نظام مرتب ہوتا ہی؟ اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں (یہ تمام تفاصیل میری کتاب معارف القرآن میں ملیں گی جس کی پہلی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔)

یہ ہی وہ ضابطۂ حیات جس کے مبلّغ علامہ اقبالؒ ہیں۔ انھوں نے فطرتِ انسانی کا عمیق مطالعہ کیا۔ پھر قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر غائر نظر ڈالی۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف نظام ہائے عمرانیت و سیاست کا قرآنی روشنی میں تجزیہ کیا اور مختلف علوم کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے بعد انھوں نے ساری دنیا کو پکارا اور کہا کہ تمہاری ناکامیوں اور نامرادیوں کا سارا راز اس میں ہی کہ تم فطرت کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کر رہی ہو۔ اگر صحیح سرفرازی و کامرانی کی زندگی چاہتے ہو تو اس کا طریق اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی نظامِ حیات کو فطرت کے متعیّن کردہ قوانین کے ماتحت لے آؤ۔ اس کا نام ہی اسلام یعنی صرف ایک اللہ کے قوانین کی محکومیت اختیار کرنا اور دنیا کے ہر غیر خدائی نظام سے منہ موڑ لینا۔ پیغامِ اقبالؒ اسی نظامِ حیات کی دلکش تفسیر ہے۔

ہم نے ابھی ابھی بتایا ہی کہ مظاہرِ فطرت کی طرح، اقوامِ عالم کی موت و حیات بھی فطرت کے

متعینہ قوانین کے تابع واقع ہوتی ہی۔ نظامِ فطرت کے ان غیر متبدل قوانین کا نتیجہ یہ ہی کہ (مثلاً) علم الافلاک کے ماہرین، صدیوں پہلے یہ بتا دیتے ہیں کہ فلاں وقت چاند یا سورج گہن میں آجائے گا اسی طرح (مثلاً) ایک حاذق طبیب کسی (بظاہر) اچھے بھلے آدمی کے چہرے کی علامات سے بتا سکتا ہی کہ وہ کس مرض میں مبتلا ہونے والا ہی اور دنیا میں اندازاً کتنے دنوں کا مہمان ہی اس لیے کہ اس کی نگہ حقیقت رس بھانپ لیتی ہی کہ اس کے چہرے کی سرخی خونِ صالح کا نتیجہ ہی یا کھسیا کا اثر۔ اسی طرح جس صاحبِ بصیرت کی نگاہوں کے سامنے قرآن کریم کے متعین کردہ قوانین ہوں وہ کسی قوم کے نظامِ تہذیب و تمدن کے آغاز ہی سے اس کے انجام کا پتہ دے سکتا ہی۔ فطرت نے علامہ اقبال کو اسی قسم کی نگہ حقیقت بیں عطا فرمائی تھی اور قرآنی تدبر سے ان میں ایسی فراست پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ہر شے کی اصل کو بے نقاب دیکھ لیتے تھے اور جھوٹے نگوں کی مینا کاری ان کی آنکھ کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی مثلاً ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بیسویں صدی کا آغاز ہی۔ مشرقی تہذیب کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئی نظامِ تمدن کی بنیاد ڈالی ہی جس کی چمک دمک نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہی۔ دنیا کی ہر قوم اس تہذیب کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہی ہر طرف سے اس کی تعریف و توصیف میں غلغلے بلند ہو رہے ہیں کہ ایسے میں فلسفہ کا ایک نوجوان طالبعلم حصولِ تعلیم کی غرض سے یورپ کے اس طلسم کدۂ ہوش ربا میں جا پہنچتا ہے۔ وہ اس نظامِ نو کے بنیادی عناصر کا مطالعہ نہایت گہری نگاہ سے کرتا ہی اور عین اس وقت جبکہ ساری دنیا اس تہذیب کی حمد و ثنا میں رطب اللسان تھی وہ اہلِ یورپ سے پکار کر کہتا ہی کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہی
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

اور سُن رکھو کہ

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ ناپائیدار ہوگا

یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد دیکھ لیجئے کہ اس انذار کا ایک ایک لفظ کس طرح پورا ہو کر رہا؟ یہ کیا تھا؟ مغربی نظامِ تمدن کو قرآنی روشنی میں پرکھنے کا نتیجہ! یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ علامہ اقبالؒ کا پورا پیام ان کے تدبر فی القرآن کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمایئے کہ جب تک علامہ اقبالؒ کے افکار و تصورات کے ماخذ (یعنی قرآن کریم) کو نہ سمجھا جائے، پیامِ اقبالؒ کس طرح کماحقہٗ سمجھ میں آسکتا ہے! کس کو ان کے فہم قرآن کی جزئیات میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اصول میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ میرے دل میں علامہ اقبالؒ کی قدر و منزلت اسی لئے ہے کہ انھوں نے اپنے افکار و پیام کا ماخذ قرآن کریم کو قرار دیا۔ اس لئے ان کے افکار و پیام میں سے کسی چیز کی اشاعت کی خبر میرے لئے وجہ مسرت ہوتی ہے، کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذریعے لوگ قرآن سے قریب تر ہو جائیں گے۔ عزیزم خالد (حالی پبلشنگ ہاؤس) کی یہ کوشش بھی میرے نزدیک درخورِ تحسین ہے کہ انھوں نے علامہ علیہ الرحمۃ کے تین خطبات کو اردو کے پیرایہ میں یکجا محفوظ کر دیا۔ ان میں سے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے خطبات کو علامہ اقبالؒ کے "سیاسی کارناموں" میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک جس طرح اسلام کو سیاسی اور غیر سیاسی شعبوں میں تقسیم کرنے کا خیال روحِ اسلام سے بیگانگی کا ثبوت ہے، اسی طرح علامہ اقبالؒ کے پیام کی سیاسی اور غیر سیاسی تقسیم ان کے پیام کے بنیادی اصول کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ علامہ اقبالؒ مسلم لیگ کے خطبہ کے شروع میں فرماتے ہیں

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی

سیاستِ مدن، اس کی ثقافت اس کی تاریخ اور اس کے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس روحِ اسلامی کے ساتھ مستقل وابستگی نے (جو دورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوتی جاتی ہے) مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقتِ ثانیہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔"

ذرا آگے چل کر ارشاد ہے۔

"لیکن اسلام وحدتِ انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔"

لہٰذا پیام اقبالؒ کی سیاسی اور غیر سیاسی تقسیم، "حدیثِ بے خبراں" ہے۔ مسلم لیگ کا خطبہ اس اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مسئلہ "قومیت" کے متعلق بھی مختصر طور پر گفتگو کی گئی ہے اگر کوئی شخص ایک فقرہ میں سمجھنا چاہے کہ علامہ اقبالؒ کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خمکدۂ عہد حاضر کے سب سے بڑے بُت، یعنی قومیت پرستی کو تیشۂ براہیمی سے پاش پاش کر دیا؟ قرآن نے انسانی تقسیم کا معیار کیا قرار دیا ہے اور اس کے برعکس نظریۂ قومیت پرستی کی رو سے یہ تقسیم کس قدر غیر فطری معیاروں کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ نیز یہ کہ خود یورپ کے اربابِ حل و عقد اب اس غیر فطری نظریہ کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آ چکے ہیں۔ ان تفاصیل کا یہ مقام نہیں (یہ چیزیں بھی معارف القرآن میں آ چکی ہیں) اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ قومیت پرستی کی اس لعنت کو بھی علامہ اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس زمانہ میں بھانپ لیا تھا جبکہ دنیا اس کی مدح و ستائش میں قصائد لکھ رہی تھی چنانچہ

وطنیت کے عنوان سے ان کی مشہور نظم ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

اس عہد میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس وقت اس صدا پر کون کان دھرتا؟ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ یورپ کے اربابِ فکر و نظر اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق کر رہے ہیں۔ تاریخ قومیت کا عالم (FREDERICK) (HERTZ) اپنی مشہور کتاب (NATIONALITY IN HISTORY POLITICS) میں لکھتا ہے۔

"وطنیت کا جذبہ اتحاد انسانی کے راستہ میں سب سے بڑا پتھر ہے .....
انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو یہ کہ وہ اپنی قومیت کو قائم رکھے اور اس طرح دنیا میں جنگ کا سلسلہ جاری رہے۔ اور یا کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد کا راستہ اختیار کرے۔"

اور امریکہ کا مشہور تہذیبی مورخ (GEORGE A. DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے۔

"میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے۔ لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ فخر انسان ہونے پر ہے۔ (اس لئے کہ) آج ہماری قومیت پرستی، نوعِ انسان کی بدترین دشمن اور تہذیب کے لئے شدید خطرہ ہے۔"

علامہ اقبال رحؒ نے کہا تھا کہ وطنیت اور قومیت کی پرستش ایک "بُت" کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ دیکھئے آج اس حقیقت کا اعتراف کس طرح کیا جا رہا ہے۔ ( ) لکھتا ہے۔

"دورِ حاضرہ کی قومیت پرستی، مذہب کے باب میں اپنے آپ کو عجیب الجھن میں پاتی ہے۔ ایک طرف اس کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے متبعین کے جذبۂ اطاعت اور وفاکیشی کو، خدا اور قوم کے درمیان بانٹنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قوم کو ایک بت بناتی ہے اور قومیت پرستی کو خود مذہب کی حیثیت دیتی ہے۔ لیکن دوسری طرف نیشنلسٹ طبقہ میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ اپنی مذہب دشمنی کا اظہار کھلے بندوں کریں۔ کیونکہ اس سے ان کے بہت سے متبعین کے جذبات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔"[1]

اور ایک نظریۂ قومیت اور وطنیت پر ہی کیا موقوف ہے۔ اگر آپ بنظرِ تعمق غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ دنیا اپنے ناکام تجارب کے بعد، اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے غیر فطری نظریات کے بتوں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ کر غیر شعوری طور پر اس روشِ زندگی کی طرف بڑھے چلی آ رہی ہے، جس پر چلنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، اور جو قرآن کے میں محفوظ ہے اور جس کی دعوت علامہ اقبالؒ نے اپنے پیام میں دی ہے۔

---

[1] مندرجہ صدر اقتباسات، معارف القرآن جلد سوم کے مقدمہ سے لئے گئے ہیں۔

اخیر میں میں ایک ایسے شبہ کا ازالہ بھی ضروری سمجھتا ہوں جس کی وجہ سے عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ جیسے کشادہ ظرف اور بالغ نظر مفکر کو نوعِ انسانی کا پیامبر ہونا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اپنی توجہات کو ملّتِ اسلامیہ پر مرکوز کرنے سے اپنے پیام کی عالمگیریت اور بکرانیت کو "فرقہ پرستی" کی جوئے کم آب میں سمٹا دیا ہے۔

یہ اعتراض بھی قرآن کی دعوت اور پیام اقبالؒ کے حقیقت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی دعوت ساری دنیا کے لئے ہے اور وہ مکان و زمان کی حدود بندیوں سے بلند و بالا، اسلام کا خدا "رب العالمین" اس کا رسول "رحمۃ اللعالمین" اور اس کا قرآن "ذکر" للعالمین" ہے۔ سو ظاہر ہے کہ ایسے خدا اور اس کے ایسے رسول اور ایسی کتاب پر ایمان رکھنے والا اقبالؒ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے خیال کو چھوڑ کر، فقط کسی ایک "فرقے" کے عروج و اقتدار کا حامی کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن پر نگاہ رکھنے والا، وحدتِ خلق اور وحدتِ خالق کی بنیادی تعلیم کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ قرآن کے سامنے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب آپ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود، یعنی ایک عالمگیر انقلاب کا ارادہ لے کر اٹھیں گے تو آپ کو آغازِ کار کسی ایک نقطہ سے کرنا ہوگا۔ قرآن کریم نے اصلاحِ عالم کا یہی طریقہ بتایا ہے کہ پہلے ایک جماعت کے قلب و نگاہ کو فطرت صحیحہ کے قالب میں ڈھال کر اسے بطور خمیر تیار کر لیا جائے۔ پھر وہ خمیر "جس آٹے" میں جا کر ملے گا اس میں بھی اسی قسم کا خمیر (تغیر) پیدا کر دے گا۔ علاوہ بریں قرآن، امنِ عالم کے قیام و بقا کے لئے اس قسم کی جماعت کا وجود اسی طرح ضروری قرار دیتا ہے جس طرح شہر کی پُرامن آبادی کو مفسدین کی شر انگیزی اور فتنہ پردازیوں

سے محفوظ رکھنے کے لئے دیانت دار، فرائض شناس۔ خداترس اور انصاف پسند محکمہ پولیس کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی جماعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں اُمتِ مسلمہ (یا ملتِ اسلامیہ) ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت کے افراد وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو قرآنی ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے ہوں۔ اقبال نے جب دنیا پر نظر ڈالی تو اسے ہر طرف فساد ہی فساد نظر آیا ہے۔ اس کا دلِ دردمند، اس کے سینہ کی گہرائیوں میں طلسمِ پیچ و تاب بن گیا۔ اس اضطراب میں وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ

قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری ہے!

اس نے اس جماعت کو ڈھونڈھا جس کے ذمّے دنیا میں حق و صداقت کے قیام کا فریضہ عائد کیا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ اس نے انھیں جھنجھوڑا کہ تمھیں دنیا میں کرنا کیا تھا اور کر کیا رہے ہو؟ ظاہر ہے کہ اگر کسی گلہ کے چوپان کو خواب سے بیدار کرنا، گلہ کی مخالفت یا پاسبان کی طرف داری نہیں کہلا سکتی، اگر کسی شہر کی پولیس کی اصلاح فرقہ دارانہ جنبہ داری پر محمول نہیں کی جا سکتی۔ کسی ملک کے ڈاکٹروں میں فرائض شناسی کے جذبات پیدا کرنا اور ان کی صحتِ عامہ کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا، جماعتی طرفداری قرار نہیں پا سکتا، تو علامہ اقبالؒ کی ملتِ اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش بھی "فرقہ وارانہ" تنگ نظری نہیں کہلا سکتی۔ ان کی یہ جدوجہد اس لئے تھی کہ وہ ان کے عروج میں نوعِ انسان کا عروج اور ان کے انحطاط میں ابن آدم کا انحطاط دیکھتے تھے۔ وہ ان میں قوت و اقتدار دیکھنے کے متمنی تھے تو اس لئے نہیں کہ اس قوت سے یہ قوم کمزوروں کا گلا گھونٹے۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے وہ مظلوموں کی حمایت و دادرسی کرنے کے

قابل ہوجائے۔ جو قرآن یہ تعلیم دیتا ہو کہ یاد رکھو۔

کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر امادہ نہ کردے کہ تم ان سے انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ انصاف کرو۔ کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

کیا اس قرآن پر ایمان رکھنے والا اقبال کسی قسم کی ناجائز جنبہ داری کا حامی ہوسکتا ہے؟ وہ اپنے خطبہ میں خود فرماتے ہیں۔

"جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر، قوانین وضوابط ..... مذہبی و معاشرتی ادارات کا بیحد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق مجھ پر یہ فرض عائد ہوجاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کروں۔

بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب، اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنادیا ہے۔ اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔"

اس ملت سے عشق اس لئے ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے فطری حقوق کی محافظ اور نظامِ عدل و صداقت کے قیام کی ذمہ دار قرار دی گئی ہے۔ میری آرزو ہے کہ پیامِ اقبال کے مطالعہ سے ملتِ اسلامیہ قرآن کے قریب آتی جائے جس سے اسے اس کا کھویا ہوا مقام پھر سے مل جائے اور اس کے بعد عروجِ آدمِ خاکی کے خواب کی وہ حسین تعبیر پھر سے وجہِ شادابیٔ قلب و نظر ہو جائے جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔

(چودھری) غلام احمد پرویز

۳۷ - ترکمان روڈ
نئی دہلی

خطبۂ صدارت

آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء

حضرات!

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانان ہندستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کرلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں اُن حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملہ فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر میں اُن مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں اور نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ

اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے رہا ہے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے؛ میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں، میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو، آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کروں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیئے۔

اسلام اور قومیت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظامِ قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندستان میں بھی جماعتِ اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہینِ منت ہے اس لئے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قانونوں اور اداروں کی شرمندۂ احسان ہے

جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندستان بلکہ ہندستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنا لیں۔ انھوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشو و نما پائی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا، اس کو کسی دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی، کیوں کہ اس قسم کا کوئی نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کے عالم گیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بیشمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہونگے اور اس وجہ سے ان کا حلقۂ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسیو کی ذات سے ہوا، اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسان سے متعلق تھا، اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لئے انھیں ایک سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصورِ وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنھوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۃً

وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظامِ اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے اس سے اہلِ مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے، ترک کر دینا چاہیے اسلام کے نزدیک مادہ روح کی ایک شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ آج اس کے بہترین اربابِ فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مصر ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کرے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت

کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا۔ انھوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہر حال دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں ہے جو ازمنۂ متوسطہ کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصۂ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں، لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصورِ قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہوگا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اس طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا، یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر نکلسن نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اسی وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیشگوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز

میں ابھار رکھا ہی اور اس طرح اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہی۔ ممکن ہی کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہی جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہی جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہی، جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اصلیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہی وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے۔ جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دار و مدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہی کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہی میں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ

اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزو مند ہیں۔ میرا مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے، اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔

قومیتِ ہند کا اتحاد

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیشِ نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟ ہندستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی وارادت ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب یا رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مترتب ہو سکتا تھا، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے

ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں، جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی بنیاد پڑی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہندستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان (RENAN) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی ہمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طول اور صبر آزما عمل ہے اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الٰہی یا اکبر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندستان کے مختلف مذاہب اور

متعدد جماعتوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو زبان کے لیے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیتِ ہند کا اتحاد اُن تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقایق کا خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم واقعات کی تکذیب یا کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیتِ ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہلِ ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ اُن قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندستان کے اندر اشتراکِ تعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر

اعتماد نہیں اور بالفرض ہم غلبہ و اقتدار کے خواہش مند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں، ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے۔ لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشو و نما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہر کیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیئے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں فرقہ داری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں جو فرقہ واری دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے، اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی اداروں کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی

کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کرکے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرِ نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ داری کے اس پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :-

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں، بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم سے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر" اور یاد رکھیے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ داری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں" ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔"

ہندستان کے اندر ایک اسلامی ہندستان

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور

اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندستان بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندستان کے اندر ایک اسلامی ہندستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان صلاحیتوں کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں، نہایت شد و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا، لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہوگا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً قسمت، بنگالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور

انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقہ کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی نا انصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبۂ حب الوطنی بڑھ جائیگا۔ اگر شمال مغربی ہندستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقا میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات ہندستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صدی ہے، لیکن ہندستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فیصدی ہے۔ اور اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فیصدی ہو جائے گی، حالانکہ اس اندازہ میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں ہیں جو بلوچستان اور صوبۂ سرحدی سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکینگے جو شمال مغربی ہندستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد

کے ساتھ مل کر خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں، اُن کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومتِ ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانانِ ہندستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہو گا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے ان کا غلبہ ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ ایک رُوحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصّہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اُس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے، اسلامی حکومت نے شرح سُود پر کوئی پابندیاں عاید نہیں کیں۔ میں صرف ہندستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندستان کے

اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

فیڈرل ریاستیں

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ ہندستان کی آئندہ حکومت کے لئے کسی مستقل لسانی اور عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے، اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ آئے، بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رُو سے تقریباً انہی اصولوں کی بنا پر میں کا اظہار میں نے کیا ہے، صوبوں کی تقسیم بھی از سرِ نو ہو جانی چاہیئے۔ میں ان دونوں تجاویز کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے پیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے اولاً یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیئے۔ ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گئی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سارے جھگڑے کی بنا

صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخاب کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ اُن کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملّت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہندستان کی یہ حالت نہیں اور نہ ہم اس کے آرزومند ہیں۔ ہندستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی، ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندستان جیسے ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اس امر کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملّت کے مفاد کی پوری پوری نمایندگی ہو سکے گی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ ہر صوبہ کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملّتیں بستی ہوں اور ان کی نسل، ان کی زبان، ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے ہندو اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور حکومت تیار کیا ہے، اُس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چل جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سرمو بھی

فرق آئے - ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہی کہ ان اختیارات کو مرکزی مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے جس میں اس وقت بھی انہی کی اکثریت ہی اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہو تو یہ کثرت اور بھی زیادہ ہو جائے گی - اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصولِ جمہوریت کا اطلاق ہو گیا، تو اس کا نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہوگا، کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی یہ طے کیا ہی کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ صوبائی حکومتوں میں کریں - اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہی، بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں، لیکن انھوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہی وہ اس سے بالکل مختلف ہی جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے - مسلمانوں نے فیڈریشن کا مطالبہ محض اس لیے کیا ہی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیہ کی صرف یہی ایک صورت ہی - برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہی وہ اصولی طور سے خواہ کتنا درست اور محکم کیوں نہ ہو، اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہی - ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہی اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے - فرقہ وارانہ مسئلے پر انھوں نے کوئی غور نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہی -

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہی، سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی پوری کر دی ہے - نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں کی اکثریت رہے وحدتی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر بآسانی ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہی - سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہی جس کی تہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا - اس کی وجہ کچھ تو یہ ہی کہ انگریز طبعاً اس اقتدار

سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے جواب تک انہیں حاصل رہا ہی اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ نہ ہوسکا تو ان کو ہندوستان پر مستقلاً اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ میں تو اس امر کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ہندوستان میں وحدتی حکومت قائم ہو۔ جن اختیارات کو "فاضل" (RESIDUARY) کہا جاتا ہی وہ صرف آزاد ریاستوں کو ملنا چاہیئے۔ مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمہ صرف ایسے اختیارات رہنے چاہئیں جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیب خاطر اس کے سپرد کردیں۔ میں مسلمانانِ ہندستان کو کبھی یہ رائے نہیں دوں گا کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی اظہارِ اتفاق کریں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

فیڈرل اسکیم اور راونڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی موثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کرلیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہی۔ یہی وجہ ہے کہ آخر الامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے باشندگان ہندستان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدتی حکومت کے طرفدار چلے آتے تھے، بغیر کسی تکلف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کرلیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب شاستری نے سرجان سائمن کی فیڈریشن والی اسکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن دفعتہً وہ بھی فیڈریشن پر رضامند ہوگئے اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس ہی

میں کر دیا جس سے وزیر اعظم انگلستان کو موقع ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیان ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے انگریز مدبرین والیانِ ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیانِ ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس اسکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصہ میں کالعدم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیانِ ریاست کی اکثریت ہوگی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہوگا، تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔

بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہو۔ لہذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو

خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن سے ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت سے اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری پارٹی سے ہوں خواہ مزدور پارٹی سے، حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

ہندستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳ فیصدی نشستیں حاصل ہوں، اسی ایک ایوان یا ایوانات میں کیوں کر پورا کیا جائے گا، جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند عنان دونوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوں گے میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں ہوا۔ البتہ رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے، اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمایندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہوگی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی، جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمے نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانوی علاقے تک محدود ہوتا۔ کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو ابتداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہندستان بدستور وحدتی حکومت کا تختۂ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت ممکن ہے کہ انگریزوں کے لئے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لئے بھی، لیکن اس سے مسلمانوں کے لئے فائدہ کی کوئی توقع رکھنا بے سود ہے جب تک کہ انھیں ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے "فاضل" اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہو جائیں۔ اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں انھیں ۳۳ فیصدی

نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ (SOVEREIGN) اختیارات کا تعلق ہے ہز ہائنس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیانِ ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں، لہذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہیئے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا، بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نمایندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ اِن اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں، ہمیں تمام فیڈریشن میں ۱/۳ نشستیں حاصل ہوں۔

مسئلہ دفاع

ہندستان میں فیڈرل نظام قائم کرنے میں ایک بہت بڑی دقت دفاع و حفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے تاکہ جنگی نظم و نسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے :-

> ہندستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندستان کے مسئلہ دفاع کو نہ اب نہ مستقبل قریب میں محض ہندستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیئے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں برطانوی ہندستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی؟ موجودہ حالت میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول

کو تسلیم کر لیا جائے۔ کہ جب کبھی ہندستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں، ان کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا، معرضِ خطر میں آجائے گی۔"

اپنے بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہندستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ:۔

"یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندستانی ایک قوم نہیں ہیں اور کبھی عیاں ہو جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے۔"

اس مسئلے کے اِن پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہرحال فیڈریشن میں جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائے گا۔ یعنی ہندستان کے خارجی تحفظ کا۔ صوبہ جاتی عساکر کے علاوہ جو ہندستان کے اندرونی امن و سکون کے ذمہ دار ہیں، ہندستان کی فیڈرل کانگریس صوبۂ سرحدی میں ایک طاقت ور سرحدی لشکر متعین کر سکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو گی۔ مجھے اس امر کا بخوبی

احساس ہے کہ ہندستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں اور یہی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھاکر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم ونسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا جس سے خود ان کا یہ اندازہ قابل اعتراض نظر آتا ہے:-

اِس وقت کوئی ہندستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندستانی کپتانوں کی کل تعداد ۲۹ ہے جن میں سے ۲۵ معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں، جب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہوسکے گا۔ ان کا بیشتر حصہ سینڈ ہرسٹ نہیں گیا۔ بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔ اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے کس قدر بچی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اسکین کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سکرٹیری کے علاوہ وہ تمام اراکین ہندستانی تھے) نہایت موثر طریق پر لفظ ترقی ..... میں جمع کر دیا ہے اس امر پر منحصر ہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً سست رہیگی موجودہ ہندستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں اور ان کا تجربہ محدود ہے۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل کرلیں۔ جب تک ہندستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ ہو جائے اور ہم اس اضافے کے دل

سے خواہشمند ہیں جب تک ہندستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کرلے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر صرف ہندستانی ہوں جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہوجائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہ ہوگا کہ فوج کے نظم ونسق کو ہندستانیوں کے ذمہ سپرد کیا جائے، اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری فوج کلیتہً ہندستانی ہوجائے۔ اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لئے ساٹھ سال کی ضرورت ہوگی۔"

اب میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس صورتحالات کا ذمہ دار کون ہے اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے یا فوجی تعلیم کی سستی رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلمہ ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے جنگی تعلیم کا عمل سست ہو۔ میں عسکریت کا ماہر نہیں لیکن عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا ہندستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم ونسق ایک دفاعی کمیٹی کے ذمہ کردیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیہ سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ ساحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خود مختار ہندستان کے

Y BRAY

لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر فیڈرل ریاست قائم ہوگئی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندستان کے تحفظ کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندستانی فوج کے قیام کے لئے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو، ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدار عساکر واقعتہً موجود تھے۔ بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظامِ حکومت میں ایک غیر جانبدارانہ ہندستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبات حب الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے حملہ ہوا تو مسلمانان ہندستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

اسلامی مطالبات

میں نے مختصراً اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ ہندستان کے دو آئینی مسائل کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کے مستقل تصفیے کے لئے برطانوی ہندستان میں صوبوں کی تقسیم از سرِ نو کی جائے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے، تو پھر میں نہایت شد و مد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا۔ جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بار بار کیا گیا ہے۔ مسلمانانِ ہندستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ اپنی اکثریت حاصل نہ کرسکیں، یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فی صدی نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط

تصور پر مرتب کیا گیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے تھے کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ عاقبت اندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت بھیجی ہے اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ان دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمایندگی کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ محض یہ امر کہ انہیں دوسرے صوبوں میں "پاسنگ" حاصل ہے اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔ لیکن تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ اس یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے حکومت ہند نے بھی اسی "نہایت احتیاط سے تیار کی ہوئی متوازن اسکیم" کی حمایت کی ہے جس کو پنجاب کونسل کے سرکاری ممبروں نے مرتب کیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمانانِ پنجاب کو پوری مجلس میں صرف ۴۹ فیصدی نشستیں ملتی ہیں اور ہندوؤں اور سکھ اراکین پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے خود اس قدر فیصلہ کن ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانانِ پنجاب کسی ایسی اسکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے انہیں پوری مجلس میں قطعی اکثریت

حاصل نہ ہو جائے۔ بہرحال لارڈ ارون اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہندگی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمایندوں سے ظاہر ہو سکے، اور جب تک تمام مسلمان باتفاق رائے جداگانہ نمایندگی کے حق سے دست بردار نہ ہو جائیں، ہندستان کی اقلیتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومتِ ہند کے نزدیک مسلمانوں کی شکایت بجا ہے تو اسے اتنی جرأت کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آہنی اکثریت کی سفارش کرتی۔

مسلمانانِ ہندستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہوگا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبہ کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیئے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہلِ سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ داں مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ ملک ہے جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے"۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ عرب کی جانب۔ مناسب ردّ و بدل کے ساتھ یہی بات سندھ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل کا جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں۔ اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے، اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس کو احاطہ

بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور ہے۔ بیشک اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گزرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند امید افزا صوبہ کو اپنی آزادانہ ترقی کی جد وجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات برسے (B RAY) کمیٹی سے بھی کم ہیں۔ اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں، محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل کسی قدر لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی۔ اور ہمارا فرض ہے کہ تمام انسانوں تک یہ روشنی پہنچائیں۔ خواہ وہ خانۂ بارود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ گزشتہ ایام میں اس بدقسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آچکے ہیں، وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر اب تک اس سے روا رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں

مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبے میں جو کچھ پیش آرہا ہی، خارجی اثرات کا نتیجہ ہی۔

حکومت ہند نے بھی اپنی یادداشت میں صوبہ سرحدی کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہی وہ ناکافی ہیں۔ بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع تر ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز کی گئی ہی، لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے حالانکہ افغان جبلتاً اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصہ لیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

میرا خیال ہی کہ مجھے اب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری اشارات کر دینے چاہئیں۔ ذاتی طور سے مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا تھا کہ فرقہ وارانہ تنازعات کی رزمگاہ سے دور ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوش مندی سے کام لیں گے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہی کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ وزیراعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہی کہ ہندستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے، قومی نہیں۔ انہوں نے کہا ہی کہ "یہ ایک دشوار بات ہوگی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کرے۔ اس لئے کہ مخلوط انتخابات انگریزی کے جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قرین ہیں۔" انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں، برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اس مسئلے کو جغرافیائی اصول پر حل کیا جائے۔

جداگانہ انتخاب کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے۔ آخر الامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمایندے اس مسئلہ کو محض سطحانہ نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے جیسا کہ اب تک ہندستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کرلیں گے کہ ہندستان کے اندر امن و سکون کے قیام کا طریق کیا ہے۔ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہوگا کہ ہندستان میں ایک ہی قوم بستی ہے۔ یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں، اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندستان کو نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کرلیا جائے کہ ہندستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ جس کو ہم نے ہندستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ منازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی رہنما کو اس طعن آمیز الفاظ (یعنی لفظ "فرقہ واری") کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیئے جسے ہندو محض پروپیگنڈا کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تاکہ بقول وزیر اعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں اور انگریز غلطی سے یہ فرض کرلیں کہ ہندستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندستان میں کوئی قوم بستی ہے تو

وہ مسلمان ہی ہیں۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں لیکن ابھی ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بے شک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں اور ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر ہونا نہیں چاہیئے کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانانِ ہندستان کی حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے، اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق باصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے۔ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھولے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اوّلین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحادِ نوعِ انسانی کی خاطر اٹھایا۔ اس نے ان لوگوں کو جن کا اخلاقی نصب العین تقریباً ایک سا تھا، باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ اھل الکتاب تعالوا علیٰ کلمۃٍ (یعنی توحید) سواءٍ بیننا و بینکم یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقع نہیں دیا کہ دنیائے اسلامی اس آیت کے لا انتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلادِ اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے

۱۲۳

مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہوگا۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ ہندستان کے مسلمان ایک ہو کر کوئی آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آیندہ قسمتوں کی تشکیل میں کارفرما ہیں لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت آئے تو ہم اپنے آپ کو اسی قسم کے عمل کے لئے تیار پائیں جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلا تکلف کہہ دینا چاہیئے کہ ہندستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر مالکم ہیلی اور لارڈ آرون کی تشخیص بالکل صحیح تھی، جب انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملت اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو عنایت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار

اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو طرزِ عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا ہے، اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لئے ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے۔ جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقہ کو اس قدر جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کے حدود ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا، بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے، تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے۔ اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفعیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ میں اس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حالات پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قرار دادیں ہی منظور نہ کریں بلکہ اپنے مقاصد میں حقیقی کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے سامنے کوئی راہِ عمل پیش کریں۔ میں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لئے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

خاتمۂ سخن

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دور میں سے گزر رہے ہیں، اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملی وجود کی بقا اور ہندستان کا مفاد صرف ایک اسی امر سے وابستہ ہے۔ ہندستان کی سیاسی غلامی تمام

ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہندستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے۔ اور ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے۔ اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے، لہذا ہمیں چاہیئے کہ ہم ہندستان کے مسئلے پر محض اس زاویہ نگہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں۔ ایشیا اور ہندستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کی بجاآوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہ کرلیں گے۔ بشرطیکہ آپ ہندستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں، دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیہ سے خوش نہیں ہوں۔ لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرکوز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراکِ عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشوونما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں؟ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جایئے اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے، اپنے

انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ مادّی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ مادیات سے گزر کر روحانیت میں قدم رکھئے۔ مادّہ کثرت ہے، لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں، تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائیگا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفسِ واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہم ہی تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اُس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے ایک واحد کی طرح زندہ رہیں؟ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندستان کی حالت وہ نہیں ہے جیسی کہ نظر آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنی آپ پر اسی وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی "انا" پیدا کر لیں گے۔

خطبہ صدارت

آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء

حضرات! مسلمانان ہندوستان نے اپنے سیاسی پیٹ فارموں سے اس قدر خطبے سنے ہیں کہ جو لوگ ان میں زیادہ بے صبرے واقع ہوئے ہیں انھوں نے ابھی سے ہمارے جلسوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے جن کی نسبت وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر اس قوتِ عمل کو جو اسلام کے دل میں خفتہ پڑی ہے، کمزور کرنے کا رجحان رکھتے ہیں اور بالآخر اسے فنا کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ملک کی موجودہ صورتِ حالات ہمارے عمل کی بھوک تیز تر کر رہی ہے اور اگر ہمارے لیڈران کوئی ایسا خاص لائحہ عمل پیش کرنے سے قاصر رہیں گے جو ہندستانی مسلمانوں کی خاص افتادِ طبیعت کے لئے موزوں ہو تو پھر محض نقل کی قوت اپنا کام کرے گی اور ہمارے نوجوانوں کو بے تحاشا واقعات کی لہر میں کود نے پر مجبور کر دے گی۔" دوسرے نے اپنی مخصوص نوجوانانہ بے صبری سے کہا کہ "عمل کو پہلے سے مرتب کردہ کسی پلان کی ضرورت نہیں

ہوا کرتی۔ وہ مدبر اس کی منطق سے بے نیاز ہوتا ہے اور خود اپنی عجیب و غریب منطق کو نشوونما دیتا ہے۔ جوں جوں وہ انسان کے دل میں سے نکل کر میدانِ عمل میں گامزن ہوتا ہے۔" یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی موجودہ نفسیاتی کیفیت۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ایسے نازک وقت میں مجھ پر اعتماد کیا۔ لیکن میں آپ کو ایک ایسے شخص کے انتخاب پر مبارکباد نہیں دے سکتا جس کی حقیقت ایک منصوبے باندھنے والے تخیل پسند انسان سے زیادہ نہیں ہے۔ شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں کہ آپ کو اس نازک موقع پر ایک منصوبے باندھنے والے شخص ہی کی ضرورت ہے اس لئے کہ جہاں منصوبے نہیں ہوتے وہاں قومیں غارت و برباد ہو جاتی ہیں۔ شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ لندن کی کانفرنس کے جو تجربات مجھے حاصل ہوئے ہیں ان کے بعد میں اس اسمبلی کی صدارتی کرسی کے لئے بہتر صلاحیت رکھتا ہوں کسی ایسے مطمحِ نظر کا انکشاف کرنا جو دنیاوی حد بندیوں سے آزاد ہو ایک کام ہے اور یہ بتانا کہ کس طرح سے وہ مطمحِ نظر زندگی بخش حقائق میں تبدیل ہو سکتا ہے بالکل دوسرا کام ہے۔ اگر ایک شخص اول الذکر کام کے لئے طبعاً موزوں ہو تو اس کا مفوضہ فرضِ منصبی نسبتہً آسان ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دنیاوی حد بندیوں پر جو عملی سیاست داں کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں ثابت ہوتی ہیں، ایک صاف جست کے مترادف ہے۔ وہ آدمی جس میں یہ جرات ہو کہ وہ اول الذکر کام سے موخرالذکر کام کی طرف اپنے آپ کو منتقل کرلے، اُسے بار بار ان حد بندیوں کا جائزہ لینا ہو گا اور بسا اوقات ان کے سامنے جھکنا پڑے گا جنہیں وہ اب تک نظرانداز کرنے کا عادی رہا ہے۔ ایسے آدمی کو بدقسمتی سے مسلسل ذہنی کشمکش میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور اس پر بآسانی تناقص بالذات کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ بہرحال میں اس پوزیشن کو خوشی خوشی قبول کرتا ہوں جس میں آپ نے مجھے ڈال دیا ہے اس لئے نہیں کہ میں اپنے آپ کو اس پوزیشن کا اہل سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ خوش قسمتی سے امورِ زیرِ بحث اس قدر واضح ہو گئے ہیں

کہ اب ساری چیزیں کسی مخصوص فرد کی رہنمائی پر اس قدر انحصار نہیں رکھتیں جتنا وہ تمام افراد کی مرضی کی قوت پر رکھتی ہیں۔ جسے کسی مقصدِ وحید پر مرکوز کر دیا گیا ہو۔

سیاسیات کی جڑیں انسان کی روحانی زندگی کے اندر جاگزین ہوتی ہیں۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام نجی رائے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک سوسائٹی اور جماعت ہے یا اگر آپ کہنا پسند کریں تو اسے شہری کلیسا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ زمانۂ حال کے سیاسی خیالات جیساکہ وہ ہندستان میں رونما ہو رہے ہیں، اس کی ابتدائی ساخت اور کیرکٹر پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اسی لئے میں سیاسیات سے دلچسپی لیتا ہوں۔ میں قومیت (نیشنلزم) کے خلاف ہوں۔ جیساکہ یورپ میں اس سے مفہوم لیا جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ اگر اس تخیل کو ہندوستان میں نشوونما پانے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے مسلمانوں کو کم مادّی فائدہ پہنچے گا۔ میں اس لئے اس کے خلاف ہوں کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادّیت کے جراثیم دیکھتا ہوں جو میرے خیال میں جدید دور کی انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ حب الوطنی صحیح طور پر ایک قدرتی نیکی ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں وہ خاص درجہ رکھتی ہے۔ تاہم جو چیز دراصل اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا عقیدہ ہے، اس کی تہذیب ہے، اس کی تاریخی روایت ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیئے اور جن کے لئے انسان کو اپنی جان تک قربان کر دینا چاہیئے، نہ کہ وہ خطۂ ارضی جس سے انسانوں کی روح عارضی طور پر تعلق رکھتی ہے۔ ہندستان کے مختلف فرقوں کے مابین ربط واتصال کے مرئی اور غیر مرئی نقاط کے پیش نظر میں ایک ایسے مربوط نظام کی تعمیر کے امکان پر عقیدہ رکھتا ہوں جس کی ہم آہنگی میں اس وسیع اختلاف سے خلل نہیں پڑ سکتا جو وہ لازمی طور سے اپنے اندر رکھے گی۔ قدیم ہندستانی فلسفہ کا یہ مسئلہ تھا کہ وحدت اپنی وحدانیت کو قربان کئے بغیر کس طرح سے کثرت بن سکتی ہے۔ آج یہ سوال اپنی اخلاقی بلندیوں سے نیچے اتر کر ہماری سیاسی زندگی کی کثیف ترین

سطح پر آگیا ہی اور ہمیں آج بالکل اس کے الٹ کا حل تلاش کرنا ہی یعنی یہ کہ کثرت کس طرح سے اپنی کثرتِ وجود کو قربان کئے بغیر وحدت بن سکتی ہی۔ لہذا جہاں تک ہماری پالیسی کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے میں کوئی نئی چیز آپ کے سامنے پیش نہیں کروں گا۔ ان کے متعلق میں اپنے خیالات اس خطبہ میں ظاہر کر چکا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے روبرو دیا گیا تھا۔ موجودہ خطبہ میں میں منجملہ دیگر امور کے آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو سب سے پہلے اس صورتِ حالات کا صحیح ادراک ہو جائے جو گول میز کانفرنس کے مباحث کی آخری منازل میں ہمارے نمایندگان کے قدرے غیر مستقل طرزِ عمل کی بدولت پیدا ہوئی۔ ثانیاً میں کوشش کروں گا کہ اپنی روشنی کے مطابق میں ظاہر کر دوں کہ یہ امر کہاں تک پسندیدہ ہے کہ ایک نئی پالیسی وضع کی جائے۔ اب جبکہ آخری لندن کانفرنس میں وزیر اعظم کے اعلان نے پھر یہ ضروری قرار دیدیا ہی کہ ساری صورتِ حالات کا سنجیدہ طریقہ سے جائزہ لیا جائے۔ آپ کی اجازت سے میں اپنے نمایندگان کے کام کی مختصر تاریخ سے اپنے خطبہ کی ابتدا کرتا ہوں۔

اقلیتوں کی کمیٹی کے پہلے دو جلسے علی الترتیب ۲۸ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوئے تھے۔ ان دونوں موقعوں پر جلسہ فرقہ وارانہ سوال کے نجی سمجھوتہ کی خاطر ملتوی کر دیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے مسلم نمایندوں سے کہا کہ معاملات آگے ترقی نہ کر سکیں گے جب تک کہ مسلم نمایندے اس پابندی کو دور نہ کر دیں گے جو انھوں نے ڈاکٹر انصاری پر عائد کر رکھی ہی۔ اس میں جب انھیں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مسلم نمایندگان سے کہا کہ میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لوں گا اور کانگریسی ہندوؤں اور سکھوں کو بھی آمادہ کر دوں گا کہ وہ انھیں منظور کر لیں بشرطیکہ مسلمان تین چیزیں تسلیم کر لیں :- (۱) بالغوں کا حق رائے دہی، (۲) اچھوتوں کے لئے خاص نمایندگی کا نہونا اور (۳) کانگریس کا مطالبۂ آزادی۔ مہاتما نے معاملے کو کانگریس سے

رجوع کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ہندوؤں اور سکھوں سے بھی اس انتظام کو منوانے کی کوشش میں ناکام رہے۔ ۷ر اکتوبر کو دو ممتاز ہندو لیڈروں نے تجویز کی کہ سارے معاملہ کو سات ثالثوں کے بورڈ کے روبرو پیش کیا جائے۔ اس تجویز کو بھی ہندوؤں اور سکھوں کے نمایندوں نے مسترد کر دیا۔ ۸ر اکتوبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کا تیسرا جلسہ ہوا۔ اس اجلاس میں مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ سمجھوتہ کرانے میں اپنی کوتاہی کے لئے برطانوی حکومت کو ذمہ دار قرار دیا اس لئے کہ ان کی رائے میں اس نے برطانوی ہندستانی نمایندوں کے طور پر جان بوجھ کر ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا تھا جو بقول ان کے کسی کے نمایندہ نہ تھے۔ مسلم نمایندوں کی طرف سے سر محمد شفیع مرحوم نے مہاتما گاندھی کے اس ناواجب ریمارک کی تردید کرتے ہوئے جس میں مختلف نمایندوں کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا، اُن تجاویز کی مخالفت کی تھی جو ان کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔ اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا؛ اور برطانوی انتخابات کی وجہ سے ۱۲ر نومبر سے پہلے پھر اس کا کوئی جلسہ نہ ہو سکا۔ اس اثنا میں نجی گفتگوئیں ۱۵ر اکتوبر سے پھر شروع ہو گئیں۔ ان گفتگوؤں کا ایک نمایاں پہلو پنجاب کے متعلق سر جیوفرے کاربٹ کی اسکیم تھی۔ یہ اسکیم اس تجویز سے بہت کچھ مشابہ تھی جو میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے روبرو اپنے خطبہ میں پیش کی تھی۔ اس میں تجویز کی گئی تھی کہ مشترک حلقہ ہائے انتخاب کو باستثنائے انبالہ ڈویژن کے سارے پنجاب کے لئے منظور کر لیا جائے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے نمایندگان نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا کیوں کہ وہ پنجاب میں مشترک حلقہ ہائے انتخاب کے باوجود بھی مسلمانوں کی اکثریت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جب یہ گفتگوئیں بھی ناکام رہیں تو ہندستانی اقلیتوں کے نمایندوں نے جو تقریباً ہندستان کی آدھی آبادی پر مشتمل ہیں، ہندستانی اقلیتوں کے پیکٹ (معاہدہ) کے امکان پر ایک دوسرے سے

مشورہ شروع کر دیا۔ ۱۲ر نومبر کو ان سب اقلیتوں نے سوائے سکھوں کے ایک معاہدہ پر دستخط کر دئے جسے اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری جلسہ میں جو ۱۳ر نومبر کو منعقد ہوا تھا، برطانوی وزیر اعظم کو باقاعدہ طور پر حوالہ کر دیا گیا۔

ہماری غیر رسمی گفتگوؤں کا یہ مختصر احوال آپ اپنی تفسیر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے نمایندوں نے فرقہ وارانہ تصفیہ کے لئے اپنی سی بہترین کوشش کی۔ صرف ایک چیز جو اب تک میرے لئے راز ہے اور جو شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک معمہ رہے گی۔ وہ اعلان ہے جو ۲۶ر نومبر کو فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں ہمارے نمایندوں نے کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ وہ اس امر پر متفق ہیں کہ صوبائی خود مختاری اور مرکزی ذمہ داری کا نفاذ ایک ساتھ شروع کیا جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ مصالحانہ اسپرٹ کا اور ملک کی سیاسی ترقی کے لئے ان کی پریشانی کا نتیجہ تھا یا بعض متصادم اثرات کا جو ان کے دماغوں پر اپنا عمل کر رہے تھے۔ ۱۵ر نومبر کو۔ اور یہ دن وہ ہے جب کہ میں نے اپنے ڈیلیگیشن سے علیحدگی اختیار کر لی ——— مسلم نمایندوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی کے مباحث میں حصہ نہ لیں گے۔ تو پھر انھوں نے ان مباحث میں اپنے سابقہ فیصلہ کے خلاف کیوں حصہ لیا؟ کیا فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں ہمارے نمایندے ۲۶ر نومبر والا اعلان کرنے کے مجاز تھے؟ میں ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں یہ ہے کہ مسلمان قوم اس اعلان کو ایک نہایت سخت غلطی سے تعبیر کرتی ہے اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ یہ کانفرنس اس اہم معاملہ پر اپنے خیالات کا پرزور طریقہ سے اظہار کریگی آل انڈیا مسلم لیگ والے خطبہ میں میں نے آل انڈیا فیڈریشن کے تخیل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ مابعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ تخیل ہندستان کی سیاسی ترقی کی راہ میں محض ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ اگر مرکزی ذمہ داری کا نفاذ آل انڈیا فیڈریشن کی تکمیل پر انحصار رکھتا ہے جس کے بارے میں مجھے

اندیشہ ہے کہ کافی طویل مدت لے گا تو اس صورت میں حکومت کو چاہیئے کہ وہ برطانوی ہندستانی صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کا نفاذ فی الفور کر دے تاکہ بنیاد جس کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے، مرکزی ذمہ داری کے آنے تک اپنے آپ کو تجربہ کے ذریعے پورے طور پر تیار کرلے، اس غرض سے کہ وہ فیڈرل سوپر اسٹرکچر کا بوجھ برداشت کر سکے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے صحیح معنوں میں جدید وضع کی فیڈرل حکومت قائم ہو، ہمیں بہت کچھ بنیادی کام کرنا ہوگا اور اپنے ڈیلیگیشن سے علیحدگی اختیار کرنے سے کچھ دن پہلے میں نے بھانپ لیا تھا کہ ہمارے نمایندگان کو بعض انگریزی سیاست دانوں نے جو یہ مشورہ دیا تھا کہ برطانوی ہندستان کے صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے فوری نفاذ کو مسترد کر دیا جائے، وہ کچھ اچھا مشورہ نہ تھا۔ حال ہی میں لفٹننٹ کمانڈر کین وردی نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "میرا خیال ہے کہ لندن میں اعتدال پسند لیڈروں کو اس بارے میں بعض انگریز سیاست دانوں نے بُرا مشورہ دیا اور انہوں نے غلطی کی کہ خوشی خوشی ان کی نصیحت کو مان لیا اور صوبائی آزادی کی بڑی قسط کو مسترد کر دیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی بظاہر اس بات پر تیار تھے کہ اس قسط پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں۔" وہ اعتدال پسند لیڈر کون تھے جن کی طرف لفٹننٹ کمانڈر نے اشارہ کیا ہے؟ لندن میں اور اب مشاورتی کمیٹی میں صوبائی خود مختاری کے فوری نفاذ کے متعلق سر تیج بہادر سپرو نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس کو دیکھتے ہوئے یہ بالکل بدیہی ہے کہ مذکورہ بالا عبارت کے مصنف کے ذہن میں ہندو لبرل نہ ہوں گے۔ میرے خیال میں ان کا اشارہ اعتدال پسند مسلم لیڈروں کی طرف ہے، جن کا فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں ۲۶ نومبر والا اعلان میرے خیال میں درحقیقت ذمہ دار ہے۔ برطانوی وزیر اعظم کے اعلان کا جو انھوں نے مرکزی اور صوبائی ذمہ داری کے ایک ساتھ نفاذ کے متعلق کیا ہے اور چونکہ صوبوں میں ذمہ دارانہ

حکومت کے فوری نفاذ کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں اکثریت رکھنے والی قوم کے حقوق کے بارے میں ہماری قوم کے مطالبات کے متعلق ایک مخصوص اعلان کی ضرورت پڑتی، اس لئے موجودہ صورتِ حالات پر اظہار رائے کرتے وقت ہمیں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ خود ہمارے لیڈران کا طرزِ عمل زیادہ تر ذمہ دار ہے برطانوی وزیر اعظم کی خاموشی کا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات پیدا کر دئے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آخری لندن کانفرنس کے اختتام پر برطانوی وزیر اعظم نے جو مایوس کن اعلان کیا اس کے بعد ضرورت ہے کہ ایک نئی پالیسی مرتب کرنے کے امکانات کی چھان بین کی جائے۔ مسلمان قدرتی طور پہ فرقہ وارانہ تصفیہ کے سوال پر حکومت کے طرزِ عمل کی طرف سے قدرے مشکوک سے ہو گئے ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ حکومت ہر قیمت پر کانگریس کے اشتراکِ عمل کو خرید لے گی اور یہ کہ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں جو تاخیر کی جا رہی ہے، وہ اس جماعت کے ساتھ سلسلۂ نامہ و پیام کے لئے کچھ بنیاد ڈھونڈنے کا امکان معلوم کرنے کی غرض سے پردہ کا کام دے رہی ہے۔ سیاسی معاملات میں حکومت پر اعتماد کرنے کی پالیسی بظاہر مسلمانوں کے دل و دماغ پر سے نہایت تیزی کے ساتھ اپنا اثر کھو رہی ہے۔ فرینچائز کمیٹی نے ان امور پر غور کرنے کے کام کو التوا میں ڈال دیا ہے جن کا تعلق حلقہ ہائے انتخاب کی ترتیب سے تھا۔ باقی رہا موعودہ عارضی تصفیہ تو اس کے بارے میں یہ بالکل بدیہی ہے کہ کوئی ایسا فرقہ وارانہ تصفیہ خواہ وہ عارضی ہو یا مستقل مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتا جو بنیادی اصول کی حیثیت سے مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ ان صوبوں میں جہاں وہ حقیقتہً اکثریت میں ہیں، اکثریت کے حقوق سے بہرہ اندوز ہوں۔ علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب کے قیام اور صوبۂ سرحدی کی حیثیت کے تعین کے بارے میں بلا شبہ یقین دلا دیا گیا ہے، لیکن مکمل صوبائی آزادی، پارلیمنٹ کے ہاتھ سے نکال کر ہندستانی صوبوں کو طاقت کا انتقال،

فیڈریشن کے ممبران کی باہمی مساوات، مضامین کی تقسیم، فیڈرل، مرکزی اور صوبائی میں نہیں بلکہ صرف فیڈرل اور صوبائی میں، پنجاب اور بنگال میں حقوق اکثریت، سندھ کی غیر مشروط علیحدگی اور مرکز میں ایک تہائی نشستیں ہمارے مطالبات کے کچھ کم اہم عناصر نہیں ہیں۔ ان امور پر وزیر اعظم کی خاموشی کا نتیجہ صرف کانگریس کے ساتھ نامعقول جنگ کی پالیسی اور ملک کے باقی حصہ کے ساتھ عدم مصالحت کی شکل میں نکلا ہے۔ تو کیا ہمیں کانگریس کی موجودہ تحریک میں اس کا ساتھ دینا چاہیئے؟ ایک منٹ کا تامل کئے بغیر میرا جواب "نفی" میں ہے۔ اس تحریک کی تہ میں جو جذبات کارفرما ہیں ان کا گہرا مطالعہ اس بات کو کلیتہً واضح کر دے گا۔

میرے خیال میں اس تحریک کی بنیاد خوف اور غصہ پر مبنی ہے۔ کانگریسی لیڈروں کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندستان کے باشندوں کے واحد نمایندے ہیں۔ آخری گول میز کانفرنس نے پوری طرح واضح کر دیا کہ وہ نمایندے نہیں تھے۔ اس پر قدرتاً انہیں غصہ آتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انگریز اور دنیا کے باقی لوگ بھی ہندستان میں فرقہ وارانہ تصفیہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندستان کی اقلیتیں ایک معاہدہ کر چکی ہیں اور یہ کہ برطانوی حکومت نے نوٹس دے دیا ہے کہ اگر ہندستانی خود آپس میں کسی پیکٹ پر پہنچنے سے قاصر رہے تو وہ اپنی طرف سے عارضی تصفیہ کا نفاذ کر دے گی۔ کانگریسی لیڈروں کو خوف ہے کہ برطانوی حکومت فرقہ وارانہ تصفیہ کے متعلق اپنے عارضی فیصلہ میں کہیں اقلیتوں کو وہ تمام چیزیں نہ دے دے جن کا وہ مطالبہ کر رہی ہیں۔ اس لئے انہوں نے موجودہ تحریک شروع کر دی ہے۔ اس دعویٰ کو شہ دینے کے لئے جو درحقیقت اپنے اندر کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا، اس معاہدہ کو ناکارہ بنانے کے لئے جو انہیں اندیشہ ہے کہ ممکن ہے آنے والے دستور میں جگہ حاصل کرے اور حکومت کو مجبور کرنے کے لئے تاکہ، وہ صرف کانگریس ہی سے مل کر اقلیتوں کا مسئلہ طے کرے، کانگریس کے ریزولیوشن نے جس کی مطابقت میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی تھی، پوری طرح واضح کر دیا تھا

کہ چونکہ حکومت نے مہاتما گاندھی کو ملک کا واحد نمایندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کانگریس نے سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ لہٰذا ایک اقلیت کس طرح سے ایسی تحریک میں شامل ہو سکتی ہے جو اس کے خلاف بھی اسی قدر ہے جتنی وہ حکومت کے خلاف ہے۔

لہٰذا ان حالات میں کانگریس کی تحریک میں اس کا ساتھ دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عند الوقت آپ کو اہم فیصلے کرنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مسلمانوں کے خیالات کی موجودہ رفتار سے پوری طرح سے آگاہ ہیں۔ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہ کرنے میں حکومت کی طرف سے جو تاخیر ہو رہی ہے اور دستوری اصلاحات کے نفاذ سے عین قبل ہی ہمارے بہادر سرحدی سپاہیوں کے ساتھ خود ان کے صوبہ میں جو برتاؤ روا رکھا جا رہا ہے، ان دونوں باتوں نے برطانوی طریقہ ہائے کار کے بارے میں مسلمانانِ ہندستان کے دلوں میں شبہ ڈال دیا ہے۔ اور اکثر لوگ ابھی سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں کہ آیا ہندستان میں تیسرے فریق کی طاقت مسلم اقلیت کے لئے سیاسی طور پر مخالف اور اقتصادی طور پر لوٹنے والی اکثریت کے مقابلہ میں اصل حفاظت کا کام دے گی یا نہیں۔ اس کی ایک گہری وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کی تیز رفتار حرکت اور بسا اوقات سیاسی دنیا میں صورتِ حالات کے فوری تغیرات ایک امپیریل ڈیماکریسی کو اجازت نہیں دیتے خصوصاً پارٹی گورنمنٹ کی صورت میں کہ وہ کسی بڑی مدت تک مخصوص پالیسیوں پر قائم رہے۔ تخیل کا فقدان موجودہ دور کے سیاست داں میں بجائے برائی کے ایک خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اور تخیل کے اس فقدان کی وجہ سے جو کسی اعلیٰ سیاسی تصور میں دوام اور تبدیلی کو مربوط کرنے کے ناقابل ہوتا ہے، موجودہ زمانہ کی سیاست مجبور ہو جاتی ہے کہ محدود دائرہ میں زندگی بسر کرے۔ اس لئے ہندستان جیسے ماتحت ملک کی صورت میں اشتراکِ عمل کرنے والی جماعتیں قدرتی طور پر یہ خیال کرنے پر مائل ہوتی ہیں کہ حکومت کے لئے مشکل زمانہ میں ان کے سیاسی طرزِ عمل کی سختی اس سیاسی پارٹی یا اس سیاسی پارٹی کی نظر میں

جو کسی وقت میں انگلستان میں برسر اقتدار آئے، یا تو بہت کم اہمیت رکھتی ہے یا بالکل نہیں رکھتی۔ انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کی نوعیت اور مطامح نظر کچھ ہی ہوں، آپ کو اپنی پالیسی کی بنیاد روشن خیالانہ مفادِ ذاتی پر رکھنی چاہیئے اور اس کی تشکیل ایسی اسپرٹ میں کرنی چاہیئے کہ ساری برطانوی قوم اس سے متاثر ہو۔ ایسی جنگ لڑنا حماقت ہے جس میں اس امر کا زیادہ امکان ہو کہ ثمرات فتح ایسے اشخاص کو حاصل ہوں گے جو ہماری جائز سیاسی خواہشات کے یا تو مخالف ہیں یا ان سے کچھ ہمدردی نہیں رکھتے۔ موجودہ حالات ایسے ہیں کہ پالیسی مرتب کرتے وقت اس غرض سے کہ قوم کی فوری مشکلات پر قابو پا لیا جائے، یہ دیکھنا آپ کے فرضِ منصبی میں داخل ہے کہ جس امکان کا مجھے خطرہ ہے وہ دور ہو جائے اور جس طریقۂ کار کا آپ مشورہ دیں اس کا فائدہ بالآخر آپ ہی کی قوم کو ملے۔

مجھے پوزیشن صاف صاف بیان کرنے دیجیئے۔ انگریزوں نے ذمہ داری قبول کی تھی کہ اگر ہندستان کے مختلف فرقے کسی سمجھوتہ پر نہیں پہنچیں گے تو وہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا عارضی فیصلہ صادر کر دیں گے۔ بعد اس کے کہ ان کے نمایندے دوسری گول میز کانفرنس کے بعد واپس لوٹ جائیں گے یہ ذمہ داری بہ حیثیت تیسرے فریق کے انگریزوں کے دعوے اور پالیسی کے عین مطابق تھی، جو ہندستان کی متخاصم جماعتوں کے مابین مساوی طریقہ سے ترازو کا پلڑا تھامے ہوئے ہیں۔ مگر برطانوی حکومت کا موجودہ طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہندستان میں ترازو کے پلڑوں کو مساوی رکھنے کے کام کو غیر جانبدارانہ طریقہ پر کرنا نہیں چاہتی اور بالواسطہ ہندستانی فرقوں کو جن سے مراد زیادہ تر ہندو اور مسلمان ہیں ایک قسم کی خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ہم نے اکثریت رکھنے والے فرقہ کو آنے یا اور اسے ان تحفظات کو تسلیم کرنے پر نارضامند پایا جن سے ہم اسی وقت دست بردار ہو سکتے ہیں جب ہم بہ حیثیت ایک ایسی قوم کے مکمل طور پر فنا ہو جانے کا خطرہ مول لیں جو آپ اپنی زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ دوسرا طریقۂ کار یہ تھا کہ ہم انگریزوں

سے انصاف کی امید رکھیں جن کا اس وقت سے جب سے انہوں نے یہ ملک مسلمانوں سے لیا ہے، یہ دعویٰ رہا ہے جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں، کہ وہ ہندستان میں ملڑپوں کو مساوی طریقہ سے تھامے رکھنے کا فرض بجا لا رہے ہیں۔ ان کے معاملہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم انگریزی جرأت اور بے لاگ پن کی جگہ مسلسل طور پر بدلنے والی پالیسی نے لے لی ہے جس کی وجہ سے کسی قسم کا اعتماد پیدا نہیں ہوتا اور جس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی پوزیشن کو ہندستان میں آرام دہ بنانا چاہتے ہیں۔ مسلم قوم کے سامنے جو سوال براہِ راست آتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ امر اس کے مفاد میں ہے کہ اس کی موجودہ پالیسی کو جس نے اب تک برطانوی مشکلات کو دور کیا ہے اور جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، مزید مدت کے لئے جاری رکھا جائے۔ یہ سوال کھلی کانفرنس کے طے کرنے کا ہے۔ اس منزل پر میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں یہ ہے کہ اگر آپ اس پالیسی کو ختم کرنے کا فیصلہ کریں تو اس صورت میں آپ کا فوری فرض ہے کہ ساری قوم کو کسی قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار کریں، جس کے بغیر کوئی خوددار قوم عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ مسلمانانِ ہندستان کی تاریخ میں نہایت نازک وقت آن پہنچا ہے۔ یا تو آپ اپنا فرضِ منصبی ادا کریں یا پھر زندگی سے دست بردار ہو جائیں

حضرات! میں اب آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اپنی توجہ کو تھوڑی دیر کے لئے دو امور کی جانب مبذول کریں جو مسلمانانِ ہندستان کے لئے نہایت اہمیت رکھتے ہیں ——— میری مراد صوبۂ سرحدی اور کشمیر سے ہے جو میرے خیال میں آپ کے دل و دماغ پر یقیناً سب سے زیادہ چھائے ہوئے ہیں

یہ دیکھنا طمانیت بخش ہے کہ حکومت نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی سیاسی حیثیت کے بارے میں ہمارے مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے اگرچہ یہ دیکھنا باقی رہتا ہے کہ اس صوبہ کے حقیقی نظم و نسق میں اس سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق رائے دہی کے بارے میں حکومت کے قواعد دوسرے صوبوں کے مقابلے میں

زیادہ فیاضانہ واقع ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اصلاحات کی مشینری اگلے مہینے سے پورے زور شور کے ساتھ چلنی شروع ہو جائے گی۔ لیکن جس چیز نے سارے معاملہ کو بدصورت بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ساتھ کے ساتھ جبر و تشدد کا دور دورہ بھی شروع ہو گیا ہے جو اہم امور میں مارشل لا سے مختلف نہیں ہے۔ دستور کے معاملہ میں جس توجہ کا اظہار کیا گیا تھا اسے نظم و نسق کے معاملے میں سخت گیری اور کوتاہ نظری کی پالیسی نے قریب قریب زائل کر دیا ہے۔ ممکن ہے حکومت کے پاس کسی کے اس حصہ میں بعض اشخاص کی انتہا پسندانہ جد و جہد کو توڑنے کے کچھ وجوہ ہوں لیکن یقیناً وہ سارے ملک میں جبر و تعدی کی پالیسی کو حق بجانب نہیں ٹھہرا سکتی۔ ہندستان کے دوسرے حصوں میں اس تحریک کے دوران میں برطانیہ نے صورتِ حالات کا جس طرح سے مقابلہ کیا ہے وہ کلیتہً اعتدال پر مبنی نہیں ہے۔ اکیلے سرحدی صوبہ میں جبر و تعدی نے جو شکلیں اختیار کی ہیں وہ کسی شایستہ حکومت کے شایان شان نہیں ہیں۔ اگر زبانی اطلاعات صحیح ہیں تو اس صورت میں صوبۂ سرحد کے برطانوی عمال کے دلوں کو ان دستوری اصلاحات کے مقابلے میں جو اس صوبہ میں نافذ کی جانے والی ہیں کہیں زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے اور یہ وہ چیز ہے جو برطانوی سلطنت کے لئے زیادہ اہم ہے۔ گرفتاریوں اور مقدمات کی تعداد کے بارے میں صحیح اور آخری اطلاع نہیں مل سکی، لیکن جیسا کہ اخبارات میں بیان کیا گیا ہے، ہزارہا اشخاص گرفتار اور سزایاب ہو چکے ہیں یا نظر بند کر دئے گئے ہیں۔ حکومت کے لئے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ آیا مراعات اور جبر و تعدی کی متناقض پالیسی افغانوں جیسی خوددار قوم کی تالیفِ قلوب پر منتج ہو گی؟ خان عبدالغفار خاں یقیناً نوجوان سرحدی افغانوں پر کافی اثر رکھتے ہیں لیکن جس چیز نے اُن کے حلقہ اثر کو اس علاقہ کے دور دراز کونوں تک میں اور سرحد کے ان پرے دیہاتوں میں اور زیادہ وسعت دے دی ہے وہ جبر و تشدد کی موجودہ احمقانہ پالیسی ہے۔ حکومت اس حقیقت سے غیر آگاہ نہیں رہ سکتی کہ اس موقع پر ہندستانی مسلمانوں کی آل انڈیا پالیسی یہ ہے کہ اس صوبہ کے

مسلمانوں کے رجحانات کو موثر طریقہ سے دبا کر رکھا جائے تاکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ نہ مل جائیں جو کانگریس کے ساتھ غیر مشروط اتحاد کے حامی ہیں۔ ممکن ہے حکومت کے نقطہ نظر سے کچھ مشکلات رہی ہوں، اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ نظم و نسق کی کارروائی اگر مختلف طریقہ سے چلائی جاتی تو ساری صورتِ حالات سنبھل جاتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سرحد میں سیاسی حالات کو اس زمانہ میں خراب سے خراب تر ہونے دیا گیا جبکہ ڈھیل اور نرمی کی پالیسی کا دور دورہ تھا اور یہ کہ متشددانہ طریقہ سے اس کے ساتھ کارروائی کرنے کی کوششیں ایسے زمانہ میں کی گئی تھیں جبکہ بیماری کا اصل علاج بھی طے کر لیا گیا تھا۔ جتنی جلد حکومت اپنی تمام متشددانہ کارروائیاں اس صوبہ سے واپس لے لے گی، اسی قدر اس صوبہ کے لئے اور خود حکومت کے لئے اچھا ہوگا اس صورتِ حالات نے تمام مسلمانانِ ہند کو سخت بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے اور حکومت کے لئے یہ دانشمندی نہ ہوگی اگر اس بارے میں مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کو ٹھنڈا نہ کیا گیا۔

کشمیر کے بارے میں میرے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ان واقعات کا پس منظر بیان کروں جو اس حصہ ملک میں رونما ہو چکے ہیں۔ ایک صوبے کے ایسے باشندوں کی اچانک بیداری جن میں خودی کی تو تقریباً بجھ چکی تھی، باوجود ان تکالیف و مصائب کے جو لازمی طور پر انہیں برداشت کرنی پڑی ہیں، ان سب کے لئے باعثِ مسرت ہونی چاہیئے تھی جو موجودہ زمانے کی ایشیائی اقوام کی اندرونی کش مکش میں نظرِ بصیرت رکھتے ہیں۔ مسلمانانِ کشمیر کی تحریک کا مقصد بالکل منصفانہ ہے اور کچھ شک نہیں کہ ایک سمجھ دار اور ہنرمند قوم میں اپنی شخصیت کی حقیقت کے اس احساس کا ظہور تا بالآخر سرچشمۂ طاقت ثابت ہوگا نہ صرف سلطنت کے لئے بلکہ بہ حیثیت مجموعی سارے ہندستان کے لئے۔ مگر جو بات حد درجہ قابلِ افسوس ہے یہ ہے کہ جو فرقہ وارانہ مخالفت ہندستان میں موجود ہے اور جو قدرتی ہمدردی ہندستانی مسلمانوں کو اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ تھی اس کی وجہ سے ہندوؤں میں ایک جوابی تحریک شروع ہو گئی جس نے حالتِ مایوسی میں ایک

وحشیانہ نظامِ حکومت کی مدافعت یہ کہہ کر کرنی چاہی کہ اس کے لازمی نتائج میں پین اسلامزم، پریشان کن تخیل اور کشمیر کے برطانوی قبضہ کے لیے سازشوں کی شکل میں نکلیں گے۔ ایسا ایجی ٹیشن اور فرقہ وارانہ رنگ جو اس کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کو دیا گیا ہے وہ صرف ایک ہی چیز کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے یعنی یہ کہ متشددانہ جبر و تعدی سے کام لیا جائے اور ریاست میں مدت دراز تک بے آئینی کا دور دورہ پیدا کر دیا جائے۔ صوبہ جموں کے بعض حصوں میں جیسا کہ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے، نظم و نسق کی مشینری بالکل درہم برہم ہو گئی ہے اور یہ صرف برطانوی افواج کی موجودگی کا اثر ہے کہ حالات کم سے کم ان مقامات میں جہاں وہ موجود ہیں، قابو میں ہیں۔ نہایت سخت اور شرمناک قسم کے تشدد کی زبانی اطلاعیں جسے ریاستی حکام بہت سے مقامات میں روا رکھ رہے ہیں، ابھی تک چلی آ رہی ہیں۔ ایسی صورت حالات میں تحقیقاتی کمیشن بھی کوئی امداد نہیں دے سکتے۔ مڈلٹن رپورٹ جو اہم حقائق کو تسلیم کرتی ہے اور ان سے صحیح نتائج استنباط کرنے سے قاصر رہتی ہے، مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس منزل سے گزر گیا ہے جس میں تحقیقات موثر نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ تمام دنیا کے باشندوں میں بیداری کا روز افزوں احساس اب یہ چاہتا ہے کہ اس احساس کو برسرِ اقتدار حکومت میں روز افزوں حصہ کی شکل میں تسلیم کر لیا جائے۔ سیاسی غلامی وحشی باشندوں کے لئے اچھی ہو تو ہو لیکن یہ خود حکومت کے بہترین مفاد کی بات ہے کہ وہ اس وقت انتہا پسندانہ اصلاحات سے جی نہ چرائے جبکہ خود باشندوں کے نظریہ کی تبدیلی اس کی متقاضی ہو۔ علاوہ اور باتوں کے جو کشمیر کے عجیب و غریب حالات کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں، اس ملک کے باشندے ایسی اسمبلی کا مطالبہ کر رہے ہیں جس میں ان کے انتخاب کردہ اشخاص جائیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ والیٔ ریاست اور حکومت ہند دونوں باشندوں کے اس مطالبہ پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ کچھ شک نہیں کہ نیا وزیر اعظم جو برطانوی نظم و نسق کی خصوصی فراست کا حامل ہے، معاملہ کی تہ تک پہنچے گا۔ اور ایک ایسی اعلیٰ مگر مظلوم قوم کی جد و جہد کے لئے میدان فراہم کرے گا جس نے قدیم ہندستان کو بعض بہترین دماغ دئے اور جس نے

بعد کو مغل کلچر میں حقیقی حسن پیدا کر دیا۔ ممکن ہو کہ کشمیر میں ہمارے اپنے ملک کی طرح دستوری اصلاحات کی راہ میں مشکلات حائل ہوں مگر مستقل امن و امان کا مفاد متقاضی ہو کہ ان مشکلات پر جلد سے جلد قابو پایا جائے۔ اگر موجودہ انقلاب کا مفہوم صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور اگر اس کے اسباب ایسے اطراف میں تلاش کئے گئے جہاں ان کا وجود نہیں پایا جاتا تو مجھے اندیشہ ہو کہ دربار کشمیر کو ایسی صورتِ حالات سے دوچار ہونا پڑے گا جو بہت کچھ پیچیدہ ہو گئی ہو گی۔

لہذا یہ بدیہی ہے کہ ہمارے مطالبات اور سرحدی صوبہ اور کشمیر کی صورت حالات کی نزاکت کے بارے میں برطانوی حکومت کا طرزِ عمل ہماری فوری توجہ کا محتاج ہو۔ لیکن جو چیز ہماری توجہ کی محتاج ہے صرف وہی ہماری تشویش کا باعث نہیں ہو۔ ہمیں ان تمام قوتوں کا صحیح صحیح تصور رکھنا چاہیئے جو خاموشی کے ساتھ مستقبل کو ڈھال رہی ہیں اور ملک میں واقعات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں، اس کا خیال کرتے ہوئے قوم کے سامنے مقابلۃً مستقل پروگرام رکھنا چاہیئے۔ ہندستان کی موجودہ تحریک کو بعض اوقات مغرب کے خلاف ہندستان کی بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ میرے خیال میں یہ مغرب کے خلاف بغاوت نہیں ہو اس لئے کہ ہندستان کے باشندے اُن ہی اداروں کا مطالبہ کر رہے ہیں جو مغرب کا نمایاں پہلو ہیں۔ یہ امر کہ آیا انتخابات کا جُوا، پارٹی لیڈروں کے خدم و حشم اور پارلیمنٹوں کے کھوکھلے تماشے کسانوں کے ملک کے مطابق ہیں یا نہیں جو موجودہ جمہوریت کی مالی اقتصادیات کو بالکل نہیں سمجھتے، ایک بالکل جداگانہ مسئلہ ہو۔ تعلیم یافتہ شہری ہندستان جمہوریت کا طالب ہو۔ اقلیتیں جو اپنے آپ کو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جداگانہ وحدتیں سمجھتی ہیں، تحفظات کا مطالبہ کرتی ہیں جنھیں اکثریت رکھنے والی قوم بدیہی وجوہ سے دینے سے انکار کرتی ہے۔ اکثریت رکھنے والی قوم ایک ایسی قومیت پر یقین رکھنے کا جھوٹا ادعا کرتی ہے جو نظریہ کے اعتبار سے صحیح ہے بشرطیکہ ہم مغربی اصولوں سے ابتدا کریں اور اگر ہم ہندستان کی طرف نظر کریں تو واقعات اُسے جھٹلاتے ہیں۔ اس طرح سے ہندستان کی موجودہ کش مکش کے فریق انگلستان اور ہندستان نہیں ہیں، بلکہ ہندستان کی اکثریت

رکھنے والی قوم اور اقلیتیں ہیں جو مغربی جمہوریت کے اصول کو تسلیم نہیں کر سکتیں جب تک کہ اس میں بطریق مناسب ایسی ترمیم نہ کر دی جائے گی جو ہندستانی زندگی کے حالات کے مطابق ہو۔

اور نہ مہاتما گاندھی کے سیاسی طریقے ہی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نفسیاتی اعتبار سے کوئی بغاوت ہیں۔ یہ طریقے شعورِ دنیا کے دو متضاد قسموں (مشرقی و مغربی) کے اتصال کا نتیجہ ہیں مغربی دماغ کی ذہنی بناوٹ نوعیت کے اعتبار سے تاریخی واقعہ نگاری بنی ہے۔ وہ وقت کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے، حرکت کرتا ہے اور بہتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے مشرقی دماغ کا شعور غیر تاریخی ہے۔ مغربی دماغ کے لئے چیزیں آہستہ آہستہ بنتی ہیں، وہ اپنا ماضی، حال اور مستقبل رکھتی ہیں۔ مشرقی دماغ کے لئے وہ چیزیں فی الفور ہموار ہو جاتی ہیں، ان میں وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی اور خالصتہً حال سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام جو وقت کی حرکت میں حقیقت کی علامت دیکھتا ہے، ایشیا کی ساکن دنیا میں مداخلت بیجا کرنے والے کی حیثیت سے ظاہر ہوا۔ انگریز مغربی باشندے ہونے کی وجہ سے ہندستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ صرف تدریجی ارتقار کے منظم عمل کے طور پر ہی کر سکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی مشرقی ہونے کی حیثیت سے اس طرزِ عمل میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں دیکھتے کہ انگریز طاقت سے دست بردار ہونے کی خواہش نہیں رکھتے اور اس لئے وہ فوری حصولِ مقصد کے لئے جملہ اقسام کے تباہ کن منفی ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ دونوں بنیادی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے کے ناقابل ہیں۔ نتیجہ بغاوت کی ظاہری شکل میں نکلتا ہے۔

مگر یہ انوکھے واقعات محض کسی آنے والے دور کی پیش آگاہیاں ہیں جو سارے ہندستان تو کیا سارے ایشیا پر پھیل جانے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے کہ ایک کلیتہً سیاسی تہذیب کا جو انسان کو ایک چیز سمجھتی ہے جس سے کام لیا جائے نہ کہ ایسی شخصیت جسے تہذیبی قوتوں کے ذریعہ نشو و نما دینے اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ایشیا کے باشندے اس اکتسابی کفایت شعاری کے خلاف جس کی نشو و نما مغرب کے ہاتھوں ہوئی ہے اور جسے مشرقی قوموں

کے سر منڈھ دیا گیا ہے، لازمی طور پر اٹھنے والے ہیں۔ ایشیا جدید مغربی سرمایہ داری کو مع اسکی غیر تربیت یافتہ انفرادیت کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں وہ فردِ واحد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت میں دے ڈالے۔ اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی درجہ اس کی ذات، رنگ یا اس کے کمائے ہوئے ڈریڈنڈ کی مقدار سے معین نہ ہوتا ہو بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غربا مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں، جہاں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر، جہاں ایک اچھوت ایک بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو، جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی شکل رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح سے اجازت نہیں دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کر لے، مگر آپ کے مذہب کا یہ اعلیٰ تخیل مولویوں اور شریعت پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔ روحانی طور پر ہم خیالات اور جذبات کے قید خانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جنہیں ہم نے صدیوں کے دوران میں اپنے گرداگرد اپنے ہی ہاتھوں سے بُن لیا ہے۔ اور اس بات کے کہنے کی بھی ضرورت ہے (اگرچہ یہ بات بوڑھی نسل والوں کے لئے باعثِ شرم ہے) کہ ہم نوجوان نسل کو اقتصادی، سیاسی اور نیز مذہبی خطرناک موانع کے لئے جو موجودہ دور اپنے ہمراہ لا رہا ہے، مسلح کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ساری قوم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی موجودہ ذہنیت کی مکمل طور پر جانچ پڑتال کرے تاکہ وہ نئے منصوبوں اور تخیلات کی لگن کو محسوس کرنے کے قابل بن سکے۔ ہندستانی مسلمان خود اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کی چھان بین کرنے سے عرصے سے غافل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی پوری چمک اور رنگینی میں زندگی بسر کرنے سے عاری ہو چکا ہے، اور

اس لئے وہ ایسی قوتوں کے ساتھ ایک غیر دیرانہ سمجھوتہ کے خطرہ میں ہے جن کے متعلق اسے یہ کہا گیا ہے کہ وہ کھلی آویزش میں ان کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود ایک مخصوص تخیل کی روشنی میں اپنی روزانہ زندگی کی جدوجہد کے دائرہ کو منور کر کے اپنی حالت کے بدلنے میں پہل نہیں کرتی۔ انسان کی اپنی اندرونی زندگی کی آزادی میں مضبوط اعتقاد رکھے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی اعتقاد قوم کی آنکھ کو اس کے انتہائی مقصد پر جمائے رکھتا ہے اور اسے دائمی تذبذب سے نجات دلاتا ہے۔ جو سبق گزشتہ تجربے نے آپ کو سکھایا ہے، اُسے ہمیشہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ کسی سے بھی کسی چیز کی توقع مت رکھئے۔ اپنی خودی صرف اپنے اوپر مرکوز رکھئے اور اپنی مٹی کو حقیقی مردانگی میں پختہ کیجئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی خواہشات پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ مسولینی کا اصول یہ تھا کہ "جو فولاد رکھتا ہے وہی روٹی کھاتا ہے" میں اس میں ذرا ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "جو خود فولاد ہے، سب کچھ اسی کے پاس ہے۔" سخت کوش بنئے اور سخت محنت کیجئے یہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا راز ہے۔ ہمارا مطمحِ نظر بالکل صاف ہے۔ وہ یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایسی پوزیشن حاصل کریں جو اسے اس ملک میں اس کی قسمت کی تکمیل کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس مطمحِ نظر کی روشنی میں قوم کی ترقی کرنے والی قوتوں کو جگانے اور ان قوتوں کو جو اب تک خوابیدہ پڑی ہیں، منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کی تو دوسروں سے قرض نہیں لی جا سکتی، اسے خود اپنی روح کے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے تو اب ہمارا آئندہ پروگرام کیا ہوگا؟ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ وہ جزواً سیاسی ہو اور جزواً مدنی ہو۔ اس سلسلے میں میں چند تجاویز آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

اولاً یہ کہ ہمیں فراخدلی کے ساتھ یہ تسلیم کرلینا چاہیئے کہ ان لوگوں کے سیاسی خیالات میں جو جدید زمانہ کی سیاسی کش مکش میں ہندوستانی مسلمانوں کی جد وجہد کی نظاہر رہنمائی کر رہے ہیں، ابھی تک ایک قسم کا خلفشار پایا جاتا ہے۔ مگر اس صورت کے لئے ہماری قوم ذمہ دار نہیں ہے۔ جمہور مسلمانوں میں قربانی کی اسپرٹ میں اس وقت کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی جب کبھی ملک میں ان کی آخری قسمت کا سوال درپیش ہوجاتا ہے۔ حال کی تاریخ میرے بیان کی کافی شہادت بہم پہنچا سکتی ہے۔ قصور ہمارا ہے نہ کہ ان کا جو رہنمائی قوم کی کی جاتی ہے ہمیشہ آزادانہ طریقہ سے اس کی تشکیل نہیں کی جاتی اور اس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر بعض اوقات نہایت نازک مواقع پر اختلاف کی صورت میں نکلتا ہے اس طرح یہ جماعتیں اُس ڈسپلن کی صحیح طور پر نشوونما نہیں کرسکتیں جو سیاسی جماعتوں کی زندگی اور طاقت کے لئے اس قدر قطعاً ضروری ہوتا ہے۔ اس خرابی کا تدارک کرنے کی غرض سے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہندستانی مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیئے جس کی شاخیں صوبوں اور ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اس کا نام آپ کچھ ہی رکھئے۔ لیکن جو چیز ضروری ہے یہ ہے کہ اس کا کانسٹی ٹیوشن ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کا سیاسی عقیدہ رکھنے والے کے لئے طاقت حاصل کرنا ممکن ہوسکے اور اپنے خیالات اور طریقوں کے مطابق قوم کی رہنمائی کرسکے۔ میری رائے میں یہ واحد طریقہ ہے نفاق انگیزیوں کو ناممکن بنا دینے کا اور ہندستان میں اسلام کے بہترین مفاد کے لئے ہماری پراگندہ قوتوں میں از سرِ نو جان ڈالنے اور انھیں ڈسپلن کے ماتحت لانے کا۔

ثانیاً میری تجویز ہے کہ اس مرکزی جماعت کو کم سے کم ۵۰ لاکھ روپے کا ایک قومی فنڈ جمع کرنا چاہیئے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم سخت دور میں سے گزر رہے ہیں لیکن آپ یقین رکھئے کہ ہندستانی مسلمان آپ کی آواز پر لبیک کہنے سے قاصر نہیں رہیں گے اگر ان پر موجودہ صورت حالات کی نزاکت کا نقش بٹھا دینے کے لئے کوششیں کی گئیں۔

ثالثاً میری تجویز ہے کہ ملک بھر میں مرکزی جماعت کی زیر نگرانی اور زیر رہنمائی نوجوانوں کی

لیگیں اور ساز و سامان سے پوری طرح آراستہ والنٹیر کوریں قائم کی جائیں۔ انھیں اپنے آپ کو خاص طور پر سوشل سروس، اصلاح رسوم، قوم کے تجارتی نظام اور شہروں اور دیہات میں اقتصادی پروپیگنڈے کے لئے وقف کر دینا چاہیئے خصوصاً پنجاب میں جہاں مسلمان کسانوں کی خوفناک قرض داری ان شدید معالجات کا انتظار نہیں کر سکتی جن کے لئے زمین سے متعلقہ انقلابات نے انتظام کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات ٹوٹنے کی حد تک پہنچ چکے ہیں جیسا کہ ۱۹۲۵ء میں چین میں ہوا جبکہ اس ملک میں کسانوں کی لیگیں معرض وجود میں آئی تھیں۔ سائمن رپورٹ تسلیم کرتی ہے کہ کسان اپنی آمدنی کا "معتدبہ حصہ" حکومت کی نذر کر دیتا ہے۔ حکومت بلاشبہ اس کے بدلہ میں امن، حفاظت، تجارت اور رسل و رسائل کی آسانیاں بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن ان برکات کا خالص نتیجہ تشخیص محاصل میں ایک قسم کی سائنٹفک درستی، مشین کے ذریعے بنی ہوئی چیزوں کے ذریعہ دیہاتی اقتصادی زندگی کی تباہی اور فصلوں کی تجارت پرستی کی شکل میں نکلتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کسان تقریباً ہمیشہ سود خوار ساہوکاروں اور تجارتی ایجنٹوں کا شکار رہتا ہے یہ صورتِ حالات خصوصاً پنجاب میں بہت سنگین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجوزہ نوجوانوں کی لیگیں اس سلسلہ میں پروپیگنڈے کے کام میں مہارت حاصل کریں اور اس طرح سے کسانوں کی امداد کریں تاکہ وہ اپنی موجودہ غلامی سے رہائی حاصل کریں۔ میری رائے میں ہندستان میں اسلام کا مستقبل بہت کچھ پنجاب میں کسانوں کی آزادی پر انحصار رکھتا ہے تو پھر نوجوانوں کی حرارت کو مذہب کی حرارت کے ساتھ مل جانا چاہیئے تاکہ زندگی کی دمک بڑھے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے عمل کی ایک نئی دنیا پیدا ہو۔ قوم محض خالصۃً حال سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ اس کا شمار مردوں اور عورتوں کی تعداد سے کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ اس کی زندگی اور جد و جہد بہ حیثیت زندگی بخش حقیقت کے پورے طور پر اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ اُس نازائیدہ لامتناہیت کی طرف اشارہ نہ کر دیا جائے جو اُس کے اندرونی وجود کی گہرائیوں میں خوابیدہ پڑی ہے۔

رابعاً میری تجویز ہے کہ ہندستان کے تمام بڑے شہروں میں مردوں اور عورتوں کے لئے کلچرل ادارے قائم کئے جائیں۔ یہ ادارے ایسے ہونے چاہئیں کہ ان کا سیاسیات سے کچھ تعلق نہ ہو۔ ان کا اصلی کام یہ ہونا چاہیئے کہ نوجوان نسل کی خفتہ طاقت کو ایکجا کیا جائے، اسے صحیح طریقہ سے یہ بتا کر کہ اسلام اب تک کیا کچھ کر چکا ہے اور ابھی تک اسے بنی نوع انسان کی مذہبی اور کلچرل تاریخ میں کیا کیا کرنا باقی ہے۔ کسی قوم کی ترقی کرنے والی قوتوں کو صرف اسوقت بیدار کیا جا سکتا ہے جبکہ ان کے سامنے ایسا کام رکھ دیا جائے جس کا مقصد فرد کی انفرادیت کو پھیلانا، قوم کو سمجھنا اور اس کا تجربہ کرنا ہو، زندگی کے علیحدہ ٹکڑوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایسے نمایاں کُل کی حیثیت سے جس میں اندرونی اتصال اور احساسات اور عمل کا اتحاد ہو اور جب ایک مرتبہ قوتیں بیدار ہوگئیں وہ نئی آدیزشوں کے لئے نئی طاقت لائیں گی اور اندرونی آزادی کا وہ جذبہ بھی جو مقابلہ کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے اور نئی خودی کا وعدہ دلاتا ہے۔ ان اداروں کو ہمارے تعلیمی اداروں کے حالات سے خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے باخبر رہنا چاہیئے تاکہ ہماری تعلیمی جد وجہد کے تمام پہلوؤں کو ایک مرکز پر مرکوز کیا جا سکے۔ ایک عملی تجویز تو میں فوری طور پر پیش کئے دیتا ہوں۔ ہارٹوگ کمیٹی کی درمیانی رپورٹ جو بظاہر دوسرے سیاسی مسائل کے ہجوم میں اب تقریباً فراموش کی جا چکی ہے ذیل کی سفارش کرتی ہے جسے میں مسلمانان ہندستان کے لئے نہایت اہمیت رکھنے والا سمجھتا ہوں۔

"اس میں شک نہیں کہ اگر ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی مذہبی مشکلات کی وجہ سے رک گئی ہو، وہاں مذہبی تعلیم کے لئے ایسے انتظامات کئے جا سکتے ہیں جو قوم کو رغبت دلائیں کہ وہ اپنے بچوں کو معمولی اسکولوں میں بھیجیں، تو اس صورت میں سرکاری نظام کو کفایت شعاری اور کارگزاری دونوں میں فائدہ پہنچے گا اور قوم کو اس رکاوٹ

سے اور تعلیمی پستی کے الزام سے آزاد کرانے کے لئے بہت کچھ کیا جا سکے گا۔"

ہم پورے طرح آگاہ ہیں کہ ایسے انتظامات کا کرنا آسان نہیں ہے اور یہ کہ دوسرے ممالک میں انھوں نے بہت کچھ بحث و مباحثہ کا دروازہ کھول دیا ہے ..... لیکن ہماری رائے میں عملی تجاویز وضع کر کے مصمم کوشش کے لئے وقت آگیا ہے اور پوری طرح آگیا ہے۔" (صفحات ۲۰۵ - ۲۰۴)

اور پھر صفحہ ۲۰۶ پر تحفظات پر بحث کرتے ہوئے رپورٹ رقمطراز ہے:-

"لہذا اگر سرکاری نظام کے اندر اب اور آنے والے کچھ عرصے کے لئے خاص انتظامات کر دیئے جائیں مسلمانوں کو اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ قوم کی زندگی میں اور اس کی ترقی میں اپنا پورا حصہ لے سکیں تو یہ امر ہماری رائے میں صحیح جمہوری یا صحیح تعلیمی اصولوں کے متناقض نہ ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ تحفظات کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور یقیناً ہماری یہ خواہش ہے کہ وہ جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ تعلیمی نظام میں الجھنوں کی حیثیت سے وہ بجائے خود غیر پسندیدہ ہیں لیکن چونکہ ہماری سنجیدہ رائے میں مسلمانوں کو ان کی موجودہ پست حالت میں رہنے دینے اور انھیں جداگانہ اداروں کے نظام کی جانب سے مہیا کردہ معمولی مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے چھوڑے رکھنے کے مقابلے میں وہ ایک ضروری طریقہ کار پیش کرتے ہیں۔ اور اس لئے ہم یہ تسلیم کرنے میں بالکل تامل نہیں کرتے کہ وہ طریقۂ کار قومی پالیسی کے وسیع اصولوں کی بنا پر حق بجانب ہے۔"

مجوزہ کلچرل ادارے یا ان کے قیام تک آل انڈیا مسلم کانفرنس کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ یہ سفارشات جو ہماری قوم کی موجودہ کیمول اور رکاوٹوں کے صحیح تصور پر مبنی ہیں، عملی جامہ پہنتی ہیں۔

خاکسار میری تجویز ہے کہ علما کی ایک جماعت قائم کی جائے جس میں ایسے مسلمان

قانون داں بھی شامل ہونے چاہئیں جنھوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہو کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے، اس کو پھیلا دیا جائے اور بشرطِ ضرورت اس کی از سرِ نو تشریح کی جائے اس طرح۔ سے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تہ میں جو روح کارفرما ہے، وہ ہاتھ سے نہ چھٹنے پائے۔ ملکی دستور علما کی اس جماعت کو تسلیم کرے گا تاکہ کوئی مسودۂ قانون جس کا تعلق مسلمانوں کے پرسنل لا (شخصی قانون) سے ہو، اس وقت تک قانون سازی کے سندان پر نہ رکھا جائے جب تک وہ اس جماعت کی کٹھالی میں سے نہ گزر جائے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے لئے اس تجویز میں جو اہمیت ہے، قطع نظر اس کے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جدید دنیا کو جس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، اسلام کے قانونی لٹریچر کی لامتناہی قیمت اور سرمایہ دارانہ دنیا کے لئے اس کی اہمیت ابھی دریافت کرنا باقی ہے جس کے اخلاقی معیار انسان کے اقتصادی طرزِ عمل کی نگرانی سے عرصہ ہوا باہر نکل چکے ہیں۔ جس قسم کی جماعت کے قیام کی میں نے تجویز کی ہے اس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ کم سے کم اس ملک میں اسلام کے معمولی اصولوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔

ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر

مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقا کی الم ریز جھلملیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریزپا نظاروں کی طرح ہم گزری ہوئی قوموں اور سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت: اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دور ہے جسے مقاصد انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ لیکن

آدمی زادہ طرفہ معجونیت

باوجود حالات گردوپیش کی مساعدت کے اس کی تخیل جو عقل کی آئینہ بردار ہے۔

اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور اُن ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے، جو اس تصویرِ مثالی میں جس کے خط و خال اس کی شانِ اکملیت کو چھپائے ہوئے ہیں جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارتِ شبینہ سے محروم ہے۔ اس کی قوتِ شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی زندگی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی ان تھک سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانین قدرت کی کہنہ طرزِ عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقار پر موثر ہیں۔

قانونِ انتخابِ فطری کے اکتشافِ عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً وراِیام کے سراپا اسرارِ بطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقتِ نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈاروں کے مقدمۂ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا انکشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہٖ ایک ہستی اعتباری ہے یا یوں کہئے کہ اس کا نام ان مجردات عقلیہ کے قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔

بالفاظِ دیگر فرد اُس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی دآنی لمحہ کے ہی۔ اس کے خیالات، اس کی تمنائیں اس کا طرز ماند و بُود اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایام زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہی جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بر سبیل اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالفِ کلی بلکہ تضاد مطلق ہے جماعت کی زندگی بلا لحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضاء مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہی جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں، اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِ عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہی یا کوئی نئی تخیل نمودار ہوتی ہی یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک برسرِ کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہی کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی و سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس مواد فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لیے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضا میں عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفسِ ناطقہ جو مدرکِ کلیات و جزئیات ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہی۔ "جمہوری رائے اور قومی سلطنت" وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں

کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اژدحامِ خلائق، جلسۂ عام، جماعت انتظامی، فرقہ مذہبی اور مجلس مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدت ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی دماغ تمام اُن مختلف خیارت کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقتِ خاص میں افراد کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی اور اکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات اور مقامات و تخیلاتِ قومی حاسہ کی دہلہ سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازے کے اندر قدم رکھتا ہے۔ اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منوّر ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگانی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود لامتناہی ہے اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں

شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض اُن غیر محدود نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کردی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بنگاہِ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیشِ نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح ہے۔ میں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں یعنی اسکی تنقید استقبالی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہوجانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہیئے۔ ہمیں لازم ہے کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آپڑے تو نئے محاسن پیدا کریں اس لئے کہ بقول نیٹشے کسی قوم کی بقا کا دار و مدار محاسن کی مسلسل و غیر مختتم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جنابِ باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم سرتا سر انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں چند تمہیدی امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ وہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) جماعت مسلمین کی ہیئتِ ترکیبی۔

(۲) اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

(۳) اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے۔

اوّلاً۔ مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا

اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی ہے بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا اس کی پولیٹیکل نشو و نما میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے، زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسّم تھا۔ لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہرِ ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیوں کر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصوّر کرے۔ قومیت کا ملکی تصوّر جس پر زمانۂ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کر کے اور ان میں رقابت کے اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر (جس تمدنِ جدیدہ کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے) دنیا کو تھوڑا بہت

فائدہ ضرور پہنچایا ہے لیکن بڑی خرابی اس تصوّر میں یہ ہے کہ اس میں علو اور افراط کا شائبہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولیٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنون لطیفہ و علومِ ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے ایک مادی شے کا تالیہ ہے جو سراسر اصولِ اسلام کے خلاف ہے اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرکِ خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں جذبۂ حبِّ وطن کا سرے سے مخالف ہوں، ان قوموں کے لئے جن کا اتحاد حدودِ ارضی پر مبنی ہو اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حب وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے، ہم مسلمانوں کی عصبیت پر نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصّب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی ان کی وطن پرستی۔ عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مُراد نہیں کہ اصولِ حبِّ نفس بجائے اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری دوائر ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصّب ہوتی ہیں۔ اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالئے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہو گی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے وہ بہت ہی کم متاثر ہو گا۔ اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مَس نہیں کیا جو اس کی قومیت کی روح رواں ہے۔ لیکن ذرا اس کے تمدن اس کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار

پر تو خردہ گیری کر دیکھئے، پھر اس کے جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑ نہ اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہی کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے، بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اُس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے، معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہی۔ ہماری قومیت ایک شے معہود فی الذہن ہے، موجود فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا ہماری آتش عصبیت کو برافروختہ کرتا ہی تو میری دانست میں یہ برافروختگی اُس فرانسیسی کے غصہ سے کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سُن کر بھڑک اٹھتا ہی۔ عصبیت سے صرف قومی پاسداری مُراد ہے دوسری اقوام کو بنگاہِ تنفر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانۂ قیامِ انگلستان جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہار تعجب نہ کیا گیا ہو جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا داخلِ عجائباتِ قدرت ہی۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایۂ تخیل سے عاری ہے۔ جس خاک سے شکسپیر، شیلی، کیٹس، ٹینی سن اور سوئنبرن پیدا ہوئے ہوں وہ بھلا خیال آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیوں کر معرا ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقۂ ماند و بود اور طرزِ غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیالِ بلا اُس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو، اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ اگسٹس کونٹ کا قول ہے کہ "چونکہ مذہب ہماری کل ہستی پر حاوی ہے، لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشوونما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہیئے"۔ یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے ویسا کسی اور قوم پر نہیں آتا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ علومِ جدیدہ تیز پا ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیدیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کا یہی خیال تھا اور دبے الفاظ میں اس نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دنیا کے ایک بڑے حصّے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصبِ اعلیٰ سے گر جائے گا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدودِ ارضی سے وابستہ ہو انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے اس لئے کہ یہ اسی اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابلِ فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل دراصل تجزیہ ہے اور اسی لئے معقولات سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہے، ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ مذہب کو فلسفۂ نظری بنانے کی کوشش کرنا میری رائے میں بے سُود محض بلکہ لغو و مہمل ہے اس لئے کہ مذہب کا مقصد

یہ نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے۔ بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو تدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرتِ انسانی کا ایک نہایا سلوب یا نمونہ پیدا کرکے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے لہذا اس پر مابعد الطبیعات کا اطلاق ہوتا ہے۔ میری مراد ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً۔ معتقداتِ مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یک رنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلبِ ماہیت لازمی ہے، اور اس قلبِ ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان و قوانینِ اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے اور اندرونی طور پر اس یک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے جو ہمارے آبا و اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔

اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر یہ تاریخ
حیرت انگیز و تعجب خیز نظر آئے گی۔ اس دن سے جب کہ
اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال
کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس
ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی
تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان
پر اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے
پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع و مانع نظام فقہ کو مدوّن کیا جو اسلامی
تمدن کا غالباً سب سے زیادہ گراں مایہ ترکہ ہے جس طرح جماعتِ مسلمین ان اختلافات
کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت
کے ہمہ گیر خیال کی لڑی میں منسلک کرنا اپنی غائت سمجھے ہوئے ہے اسی طرح مسلمانوں
کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے اور ان کا وجود اور نشو و نما کسی ایک
قومِ خاص کی دماغی قابلیتوں کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ البتہ ایران اس تہذیب و
شائستگی کی نشو و نما کا جزو اعظم قرار پا سکتا ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ
تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ اہم واقعہ کونسا ہے تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب
دوں گا کہ فتح ایران۔ معرکۂ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب سرزمین
کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلّط کر دیا جو سامی اور آریہ مسالے سے ایک
نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی تمدّن سامی تفکر اور
آریہ تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے
ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے
بطن سے اور اس کا وقار و متانت اسے اپنے سامی باپ کے صلب سے ترکہ میں

ملا ہی فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گراں مایہ متاع ہاتھ آئی جو تسخیر یونان کے باعث اہل روما کے حصہ میں آئی تھی۔ اگر ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل یک رخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی شکل ہی بدل دی عقلی و ادراکی لحاظ سے مردہ نہیں ہے۔ ایران جس کی پولیٹیکل آزادی کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے ابھی تک اسلامی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جواب تک چلا آیا ہے بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرہویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلاخیز و مصیبت انگیز ہوگا۔

بہرحال یہ ایک پولیٹیکل بحث ہے جس میں میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت مسلمین کا زندہ رکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہیئے "صبغۃ اللہ" کے اس حکم میں غلط لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دورنگی چھوڑ کر ایک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیا کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس اندازِ خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز امر ہے۔ اور جو مسلمانوں کو ایک غائت مختصہ و مقصدِ معینہ کے پیرایہ سے آراستہ کر کے انہیں "کُلُّ مُؤمِنٍ اِخوَۃٌ" کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔

ثالثاً۔ شقِ ثانی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلامی سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی

ہے بخت و اتفاق کی کورانہ قوتوں ہی کا ماحصل نہیں ہیں زمانۂ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانینِ معینہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانۂ قبل تاریخ میں جب کہ زندہ رہنے کے لئے انسان کو سخت جد وجہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں وہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہد للبقا کی کش مکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا تو دورِ شجاعت گیا اور باصطلاح گڈنگس دورِ مروّت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی، لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا جو نشاطِ عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو اور فیاضی و ایثار اور ہم نوالگی و ہم پیالگی کے گوناگوں اوصاف سے متصف ہو۔ لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا، لہٰذا ان کے عمل کا رد ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا۔ جس کی غایت الغایت ضبطِ نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت و تقشف کیساتھ نظر ڈالتا ہے۔ ہندستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اسلوب اوّل کا مظہر نظر آتا ہے، بابر اسالیب اوّل و دوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندستان کی اسلامی قومیت کی نشو و نما کا نقطۂ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سُنے ہیں، عالمگیر کا نام سفّاکی و قساوت، جبر و استبداد، مکاری و غدّاری اور پولیٹکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلط مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ میں معاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولیٹکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے عہد کے

واقعات کا بنظرِ انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات اُس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعات متعاصرہ کی غلط تعبیر اور اُن تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنتِ اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہی ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں ایک ایسا اسلوب سیرت تیار کرنا چاہیئے جو اپنی خصوصیات مختصہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی نہ اختیار کرے اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے زرین اصول کو پیشِ نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے اُن تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو اس کی روایاتِ مسلمہ و قوانینِ منضبطہ کے منافی ہوں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی عمرانی رفتار کو نگاہِ غور سے دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہی جو قوم کے اخلاقی تجربہ کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بوجہ اس خفیف سے اختلاف کے جو وہاں کے عقلی حوالی میں ساری و دائر ہے اس اسلوب سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زبردست تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہی۔ جناب مولانائے اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرایہ میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجہ پر نہ جایئے۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک

آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ ان کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔ غرض اس جماعت میں جس کے اجزائے ترکیبی کی نوعیت واحد ہو خیالات و جذبات کا تعلق یہاں تک گہرا ہوتا ہے کہ اگر اس جماعت کے ایک حصّہ کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کے بر لانے کا سامان یک بیک دوسرا حصّہ پیدا کر دیتا ہے۔

اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ اس وقت تک جو بحث میں نے کی ہے اس میں ذیل کی تین حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) مذہبی خیال اسلامی جماعت کا سرچشمۂ زندگانی ہے۔ اس جماعت کی صحت و توانائی کے قائم رکھنے کے لئے اُن مخالف قوتوں کی نشو و نما کو جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں بغور دیکھتے رہنا چاہیئے اور خارجی عناصر کی صریح آمیزش سے اوّل تو بچانا اور یا اگر آمیزش منظور ہی ہو تو اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ آمیزش آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتا کہ نظامِ مدنی کی قوتِ آخذہ اور جاذبہ پر زیادہ زور نہ پڑے اور اس طور پر یہ نظام بالکل ہی درہم و برہم نہ ہو جائے۔

(۲) جماعتِ اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو اس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے ماخوذ ہونا چاہیئے جو اس کے آبا و اجداد کی دماغی قابلیتوں کا ماحصل ہے تاکہ وہ ماضی و استقبال کے ساتھ حال کے ربط و تسلسل کو محسوس کرتا رہے۔

(۳) اس کے خصائل و شمائل اس خاص اسلوبِ سیرت کے مطابق ہوں جس کو میں نے اسلامی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔

اب میں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہاں بانیِ مذہب، ادب، حکمت، درس و تدریس وقائع نگاری، صنعت و حرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے اس کی مبسوط

تنقید کی ضخیم جلدوں کی محتاج ہو گی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آرہے ہیں وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں۔ اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام بے حد محنت طلب ہے اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانانِ ہند کے کارناموں سے متعلق ہو گا، اگرچہ اس موضوع پر بھی اُن مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں، میں شرح و بسط کے ساتھ رائے زنی نہ کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کروں گا:۔

(۱) تعلیم۔

(۲) عامۂ خلائق کی عام حالت کی اصلاح۔

گذشتہ پچاس سال کے دوران میں مسئلہ تعلیم ہماری ہمتوں اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے۔ یہ سوال کرنا بیجا نہ ہو گا کہ آیا اشاعتِ تعلیم میں ہم نے کسی خاص رعایت کو پیشِ نظر رکھا ہے، یا استقبال کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر محض حال کی فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے؟ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص تیار کئے ہیں؟ آیا اُن اشخاص کی قابلیت ایسی ہے کہ ہم مسلمانوں کی سی مخصوص الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے؟ ان سوالات کے جوابات کنایتہً پہلے ہی دئے جا چکے ہیں۔ علم النفس کے اصول سے جو لوگ واقف ہیں انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نفسِ ناطقہ کی وہ کیفیت جسے استبصار یا ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہیں، ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے۔ جب نفسِ ناطقہ کے سلسلۂ ہوشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفسِ ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربہ کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ قوم کو اپنے اسلاف سے میراث میں پہنچتا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس

توارث متوالیہ کی موید ہو کر نفسِ ناطقۂ قومی کو استبصارِ کامل بنائے تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہو سکے۔ فردِ کار البتہ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے اگر بڑھ سکتا ہے تو اسی دانستہ کوشش سے، تعلیم کے ذریعے سے۔ روایاتِ مجتمعہ کے جو مختلف اجزاء اس طور پر منتقل کیے جاتے ہیں وہ نفسِ ناطقۂ قومی میں جذب اور پیوست ہو کر اُن چند افرادِ قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گزر جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوم کی قانونی، تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مقننوں، مورخوں اور انشا پردازوں کی چشمِ بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں؛ اگرچہ قوم کو مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے اس نقطۂ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دینوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جو لانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علیٰ روس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے بیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اُس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوفِ تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابلِ تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن با ایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استحساناً اور استشہاداً رجوع کرنا پڑتا

ہے۔ عقلی وادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ہم نے اپنی تعلیمی جد وجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے۔ نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں :۔

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جس نے مغربی تعلیم کے بارے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر بڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کے سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب العلمانہ زندگی سے چونکہ گذشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے لہذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی

تصورات سے نابلد ہے روحانی طور پر بمنزلہ ایک بیجان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے، ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیئت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

ہماری قومی سرگرمیوں کی محرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی چاہئیں۔ قوم کی وحدت کی بقا اور اس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزوؤں کا ایک ایسا نصب العین ہے۔ جو نوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو میری رائے میں قوم کے لئے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجویٹ کے زیادہ سرمایۂ نازش ہے جس کی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلۂ جلب منفعت ہے، جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی و ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر

ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دارالعلم کی ضرورت میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ دارالعلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز یا رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہیئے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اُس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتسابی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا۔ اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔

لیکن ہندستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروغ کی تلقین کے لئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقایق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیئے۔ الندوہ۔ علی گڈھ کالج۔ مدرسۂ دیوبند اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو

رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دار العلم ہونا چاہیئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کا نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندستانی مسلمان کو ڈھلنا چاہیئے۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک ایسا مثالی دار العلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجیب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اس بحث کے خاتمے سے پہلے میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند کلمات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے اس پر تفصیلی رائے زنی کرنے کی یہاں گنجائش نہیں البتہ کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ بفحوائے آیۂ کریمہ الرجال قوامون علی النساء میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہو عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بیحد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی۔ اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افراد قوم کی شرح ولادت کو تعلق ہے جو نتائج مترتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسب معاش

کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی یہ اقتصادی حرکت دولت کی پیداوار میں معتدبہ اضافہ کرے گی لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کردی، اور ثابت کردیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حرکت توڑ دیتی ہے۔

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانۂ حال میں کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے سے نشوونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان اور مکان کے پردہ کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بعد المشرقین حائل تھا اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ہی لیا میٹ ہو جائیں گی۔ جو عظیم الشان اقتصادی عمرانی اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں، ان کے نتائج کے بارے میں کوئی شخص پیش بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ گو کسی قوم کے لئے بغرض تکمیل صحت اپنی تمدنی آب و ہوا کی تبدیل کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب کرنا قرین مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید میں شتاب زدگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظام قومی کے اعضاء رئیسہ میں اختلال عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پزیر ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت اسلام کی تعلیم اور عالم نسواں کے متعلق علم الاعضاء و علم الحیات کے اکتشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہیئے جو اسلام

نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اس کے لئے مقرر کی گئی ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔

میں نے سطور بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو ہے۔ چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ہی ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتداء میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائض اولین ہیں۔ تمام وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں باحتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں، انھوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لئے کوئی خاص نصاب تعلیم معین و مرتب نہیں کیا۔ اور ان میں سے بعض بزرگوں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل ایک خارجی مواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے، کوئی فرق نہیں سمجھ سکے۔

اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی

طرف متوجہ کرتی ہے۔ یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو، ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمھاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔ ہمارے نوجوان علم بردارانِ اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوا کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں، شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقے کے ایک اور طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سستی و کاہلی اور بداعمالی و سیہ کرداری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا دیتے ہیں۔ کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہِ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرّے لگایا کریں بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں؟ سب سے زیادہ اہم عقدہ اُس مسلمان کے

سامنے جو قومی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے، یہ ہے کہ کیوں کر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ ہندستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک اُن بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات عادات اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے، اسے چاہیئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے۔ اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے، اس لئے کہ اقتصادی قومیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مال گزاری کا آئے دن کا اضافہ، مسکرات، ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی (خواہ اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں موثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتدا اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں تو ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں، اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان پیشوایان قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر صرف کئے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بحصہ رسدی ملتی رہیں۔ یہ کوشش بجائے خود ضرور قابل ستایش ہے اور تا وقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو، ہمارے سربرآوردگان ملت کو برابر اس کوشش

میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انھیں مدنظر رکھنی چاہیئے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت محدود ہے۔ وہ چند اشخاص کو ضرور آسودہ خوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت میں آسودہ و خوشحال ہو سکتے ہیں جبکہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں، اس کے لئے سپہ گری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر پڑنا یقیناً تکلیف دہ ہے، لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے، لہذا یہ کودوں تو دلنی ہی پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیئے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامہ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف اُن چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے علماء کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہیئے کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے خود کافی و کفیل نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتماد باہمی، دیانت داری، پابندی اوقات اور تعاون

وہ اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارتِ فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندستان میں بہت سے کارخانے محض اس لئے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ تو ایک دوسرے پر بھروسہ تھا اور نہ اصول امداد باہمی ان کا رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاری گر، اچھے دوکان دار، اچھے اہلِ حرفہ اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ انھیں اوّل پکّا مسلمان بنائیں ؛